معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۴ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۴ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی زندگی قرآن مجید کی خدمت اور اس میں غور و فکر کیلئے وقف رہی، انھوں نے اسکی فہم و معرفت کی راہ ہموار کرنے کیلئے اپنے خاص نہج کے مطابق بعض لوگوں کی تربیت بھی کی اور انکی یادگار مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کا مقصد بھی قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ہے، یہاں جو دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں انکا محور و مرکز قرآن مجید ہی کو بنایا گیا ہے، مولانا کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے اپنے استاد کے علوم و معارف کی شرح و ترجمانی کر کے ان سے اہل علم کو بڑی حد تک متعارف کرایا، ہندوستان میں انکے افکار و نظریات کی ترویج درس و تدریس کے ذریعہ انکے خاص شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اور تصنیفات کی اشاعت کے ذریعہ انکے اداشناس مولانا بدر الدین اصلاحی مدظلہ ناظم مدرسہ و دائرہ حمیدیہ نے کی، اور اب مدرسہ کے قدیم طلبہ کی انجمن کی حرکت و دلچسپی سے "فکر فراہیؒ" کا فروغ ہو رہا ہے، انجمن کی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ ہے جہاں سے علوم القرآن کے نام سے ایک ششماہی رسالہ شایع ہو رہا ہے جو قرآنیات کے متعلق مفید اور بلند پایہ مضامین کے لیے مختص ہوتا ہے۔ انجمن نے مولانا کی تصنیفات کی اشاعت کا منصوبہ بھی بنایا ہے اور بعض کتابیں شایع بھی کی ہیں۔

تین برس پہلے انجمن کے زیر اہتمام مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں ایک یادگار سمینار ہوا جس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ بھی شایع ہو گیا ہے، اس سال بھی ۶ تا ۸ اکتوبر کو انجمن نے مدرسہ میں "نظم قرآن" کے موضوع پر دوسرا سمینار کرایا جس میں ملک میں دفعتاً پیدا ہو جانے والی ایک خاص صورتحال کی وجہ سے ملک و بیرون ملک کے بعض اصحاب علم شریک نہیں ہو سکے تاہم یہ اپنے مقصد، نظم و ضبط، حاضرین کی تعداد اور اس لحاظ سے بہت کامیاب رہا کہ اس میں ۲۱ مقالات پڑھے گئے، سمینار کا افتتاح انجمن کے صدر اور ملک کے مشہور عالم و مصنف مولانا صدر الدین اصلاحی نے کیا اور افتتاحی جلسہ کی صدارت بھی کی، خطبۂ استقبالیہ مولانا نفیس احمد اصلاحی نے اور کلیدی خطبہ ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحی نے پڑھا، مقالات کے ۵ جلسے علی الترتیب پروفیسر یسین مظہر صدیقی، مولانا جلال الدین عمری، مولانا محمد فاروق خاں، راقم الحروف اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کی صدارت میں ہوئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ہمدرد دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی،

تکمیل الطب کالج لکھنؤ، دار المصنفین اعظم گڈھ، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ حضرات نے مقالے پڑھے، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی نے جلسوں کی کارروائی خوش اسلوبی سے چلائی اور مدرسہ و انجمن کے عہدیداروں، اساتذہ اور طلبہ نے مہمانوں کو آرام و راحت پہنچانے کے لیے غیر معمولی جد و جہد کی۔

نظم قرآن مولانا فراہیؒ کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے، وہ اس کو قرآن فہمی کا اہم وسیلہ اور بنیادی کلید سمجھتے تھے، انھوں نے اسکا جامع و وسیع اور ہمہ گیر تصور مدلل طور پر پیش کیا اور اپنی تصنیفات اور مختلف سورتوں کی تفسیر میں اسے عملاً برت کر بھی دکھایا اور یہ واقعی انکا عظیم الشان کارنامہ ہے، تاہم متقدمین علماء کے یہاں بھی یہ تصور موجود ہے بلکہ بعض نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور بعض نے اپنی تفسیروں میں وجوہ نظم بیان کیے ہیں، اس سمینار میں نظم کی ضرورت و اہمیت اور مفہوم کی وضاحت کے علاوہ نظم قرآن کے متعلق مولانا فراہیؒ کے خیالات و تصورات کے ساتھ ہی دوسرے علماء کی تصنیفات اور تفسیروں کا جائزہ لیکر انکے تصورات نظم بھی واضح کیے گئے، اور بعض مقالات میں کسی متعین یا کئی سورتوں کے نظم و ترتیب کو واضح کیا گیا، راقم نے امام رازیؒ کی تفسیر سے آیات کے ربط و نظم کی مثالیں پیش کیں، مولانا عنایت اللہ سبحانی کے عربی مقالے میں سورۂ قمر کے اعجاز و نظام کو اچھے انداز میں پیش کیا گیا تھا اور مولانا جلال الدین صاحب نے بعض سور مفصلات کے نظم پر گفتگو کی تھی۔ مقالات پر خوشگوار ماحول میں بحث و مباحثہ بھی ہوا، دعا ہے کہ یہ مفید سلسلہ جاری رہے تاکہ قرآن مجید میں تدبر کا مذاق پیدا ہو اور مدرسہ کے مقاصد اور مولانا فراہیؒ کے افکار کی اشاعت بھی ہو۔

کلکتہ کے بعض ذی شعور لوگوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے ۱۹۶۸ء میں مسلم پروگریسیو سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی تھی جس نے فری کوچنگ سنٹر، پروگریسیو ڈے اسکول، مقابلے کے امتحانات کیلئے تربیتی کلاس اور ایک لائبریری قائم کی ہے، سوسائٹی کے زیر اہتمام تعلیمی و ادبی پروگرام بھی ہوتے ہیں، ۲۵ ستمبر کو "مسلمانوں کے موجودہ تعلیمی و اقتصادی مسائل اور انکا حل" کے موضوع پر ایک کل ہند سمینار ہوا جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں نے کی اور پروفیسر عبد المغنی نے اس کا افتتاح کیا، کلکتہ اور باہر سے آئے ہوئے حضرات نے

مقالات پڑھے اور تقریریں کیں۔ راقم نے بھی اس کے لیے مضمون لکھا تھا مگر تقریر ہی کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور اس پر زور دیا کہ مسلمانوں کی دینی درسگاہوں میں جدید علوم پڑھائے جائیں تاکہ مسلمان وقت کے اقتضا، موجودہ معیار اور اسلوب کے مطابق اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام کر سکیں جو ان کا اصلی فریضہ ہے، اسی طرح جدید تعلیم گاہوں میں قرآن مجید، احادیث نبوی اور تاریخ اسلام کے درس کا اہتمام کیا جائے تاکہ مسلمان اپنے دین اور اپنی تاریخ و تہذیب سے واقف ہو کر اپنے امتیاز و تشخص کو باقی رکھ سکیں، اس کی وجہ سے طلبہ پر بوجھ تو بڑھے گا مگر اسے اٹھانا ضروری ہے، معاشی مسئلہ بھی تعلیمی پسماندگی دور کر کے حل کیا جا سکتا ہے اور اسکے لیے ٹکنیکل و رٹیکل اسکول اور کالج کھولے جائیں۔

وقت کم تھا، کلکتہ میں دار المصنفین کے قدر دانوں کا وسیع حلقہ ہے، لیکن صرف حاجی منظور علی صاحب مالک اڈین ہوٹل سے ملاقات اور مولانا حکیم زماں حسینی صاحب کی عیادت کے لیے جا سکا، دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے موقر رکن اور کلکتہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس خواجہ محمد یوسف صاحب، جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند اور جناب کلیم الدین شمس صاحب وزیر حکومت مغربی بنگال نے میری قیام گاہ پر تشریف لا کر ممنون کیا۔ مؤخر الذکر دونوں حضرات نے قوم و ملک کے حالات و مسائل پر بڑی دردمندانہ گفتگو کی اور دار المصنفین تشریف لانے کا اشتیاق ظاہر کیا، سوسائٹی کے سکریٹری جناب زین العابدین صاحب سایہ کی طرح ساتھ رہے اور کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔

گذشتہ ماہ مولانا سید احمد ہاشمی ناظم عمومی ملی جمعیۃ علمائے ہند سے ملاقات ہوئی تو کسی فرصت کے وقت ہفتہ عشرہ کے لیے دار المصنفین تشریف لانے کا وعدہ کیا، انکی معیت میں جناب الحاج سی۔ کے جعفر شریف صاحب وزیر ریلوے حکومت ہند سے بھی ملنے گیا۔

مقالات

چند قومی مرثیے

از پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ

(۲)

خاقانی نے ۵۶۹ھ دوسرے حج سے واپسی کے موقع پر یہ منظومہ لکھا جو قصیدۂ مدائن کے نام سے مشہور ہے لیکن جو دراصل ساسانی دور کی علمی و ثقافتی ترقی کا مرثیہ ہے، خاقانی کا یہ قصیدہ کافی مشہور ہوا اور کئی شاعروں نے اس کے جواب میں نظمیں لکھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی خاقانی کے قصیدے کے درجے کو نہیں پہنچ سکا۔ ذیل میں اس منظومہ کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ یہ دراصل ساسانی دور کے ایران کا قومی مرثیہ ہے

ہاں ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان
ایوان مدائن را آئینۂ عبرت دان

اے عبرت حاصل کرنے والے دل ذرا غور سے دیکھ تو تجھے معلوم ہوگا کہ مدائن کے محل آئینۂ عبرت ہیں۔

یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن
وز دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن ران

دریائے دجلہ کے کنارے چل کر ذرا مدائن میں ٹھہر جا، تو تو اپنی آنکھ سے اتنا آنسو بہائے گا کہ دوسری دجلہ بہنے لگے گی۔

خود دجلہ چناں گرید صد دجلۂ خوں گوئی

خود دجلہ ایسا رو رہی ہے گویا اس میں سیکڑوں

کز گرمی خونابش آتش چکد از مژگان

دجلہ خون بہ رہا ہے اور خون اور پانی کی آمیزش میں اتنی گرمی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھ سے آگ نکل رہی ہے۔

بینی کہ لب دجلہ چون کف بدہان آرد
گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چندان

تو دیکھے کہ دجلہ کے کنارے جیسے منھ میں کف جم گیا ہو، ایسا لگتا ہے کہ آہ کی گرمی سے ہونٹوں پر اتنے آبلے پیدا ہو گئے ہیں۔

از آتش حسرت بین بریان جگر دجلہ
خود آب شنیدستی کآتش کندش بریان

حسرت کی آگ سے جگرِ دجلہ بھن رہا ہے، یہ عجیب بات ہے کیا کبھی سُنا ہے کہ آگ پانی کو بھون دے۔

بر دجلہ گری نونو وز دیدہ زکاتش دہ
گرچہ لب دریا ہست از دجلہ زکات استان

دجلہ پر تو طرح طرح سے آنسو بہا، یہ آنسو بہانا گویا تیری آنکھ کی زکات ہے، اگرچہ خود دریا کا کنارہ دجلہ سے زکات لے رہا ہے۔

گر دجلہ درآموزد باد لب و سوز دل
نیمی شود افسردہ نیمی شود آتشدان

دجلہ میں باد لب (آہ) اور سوز دل کی آمیزش ہے اس کا نصف ٹھنڈا ہے اور نصف دوم آتش دان۔

تا سلسلۂ ایوان بگسست مدائن را
در سلسلہ شد دجلہ چون سلسلہ شد پیچان

جب ایوان مدائن کا سلسلہ ٹوٹا تو دجلہ کا سلسلہ ایسا شروع ہوا جیسا کہ زنجیر پیچان ہوتی ہے۔

گہ گہ بزبان اشک آواز دہ ایوان را

کبھی کبھی آنسوؤں کی زبان سے ایوان

تا بو کہ بگوش دل پاسخ شنوی ز ایوان

مدائن کو پکار، امید ہے کہ ایوان کا جواب تو اپنے گوش دل سے سُن لے۔

دندانۂ ہر قصری پندی دہدت نو نو
پند سر دندانہ بشنو ز بن دندان

ہر محل کے ٹوٹے ہوئے کنگوروں میں جو دندانہ پڑ گئے ہیں ان سے طرح طرح کی نصیحت ملتی ہے اور تجھے چاہیے کہ ان نصیحتوں کو تم بڑی توجہ اور خلوص سے سُنو۔

گوید کہ تو از خاکی ما خاک توایم اکنون
گامی دو سہ بر ما نہ و اشکی دو سہ ہم بفشان

محل سے یہ نصیحت آتی ہے کہ تو خاک ہے اور اب ہم تیرے پیروں کی خاک ہیں، دو چار قدم ہمارے کھنڈروں پر رکھنا اور دو چار آنسو بھی بہاتا جا۔

از نوحۂ جغد الحق مائیم بدرد سر
از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشان

کھنڈروں میں اُلّوؤں کی آواز سے ہیں کہ انکی چیخ پکار سے میرے سر میں درد ہونے لگا ہے اے سیاح! اپنی آنکھوں سے آنسو بہا جو میرے حق میں گلاب ہوگا اور وہ میرے دردِ سر کو دور کر دے گا۔

آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی
جغد است پی بلبل نوحہ است پی الحان

بھائی! تعجب کا کیا مقام ہے، اس لیے کہ دنیا کے باغ میں بلبل کی دلکش آواز کے ساتھ اُلّو کی نفرت انگیز آواز، اور خوش الحانی کے ساتھ نوحہ و فریاد کی آواز بھی ہے۔

ما بارگہ دادیم این رفت ستم بر ما
بر قصر ستمکاران گوئی چہ رسد خذلان

ہم تو حق و انصاف کی بارگاہ تھے، ہم پر یہ ستم، تو ظالموں کے محلوں پہ نہ جانے کیا کیا تباہی آئے گی۔

گوئی کہ نگون کردست ایوان فلک وش را
حکم فلک گردان، یا حکم فلک گردان

گویا پھرنے والے آسمان کے حکم و تاثیر سے مدائن کے فلک بوس محل گر چکے ہیں، اگر ممکن ہو تو آسمان کے حکم کو پھیر دے۔

بر دیدۂ من خندی کاینجا چہ می گرید
گریند بر آن دیدہ کاینجا نشود گریان

تو میرے رونے پر ہنس رہا ہے کہ تیری آنکھ کیوں گریہ و زاری میں مصروف ہے، دراصل یہ اس آنکھ پر رو رہی ہیں جو ایسی دردناک کہانی سے متاثر نہ ہوں اور نہ روئیں۔

این ہست ہمان ایوان کز نقش رخ مردم
خاک در او بودی دیوار نگارستان

یہ وہی محل ہے کہ جس پر آدمیوں کے چہروں کی تصویر سے وہ نگارستان — PICTUREGALLERY — کی دیوار معلوم ہوتا تھا۔

این ہست ہمان درگہ کو را ز شہان بودی
دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستان

یہ وہی دربار ہے جہاں ملک بابل سلحدار (دیلم) تھا اور شاہ ترکستان کی حیثیت غلام کی تھی۔

این ہست ہمان صفہ کز ہیبت او بردی
بر شیر فلک حملہ شیر تن شادروان

یہ وہی ایوان ہے جس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ سراپردے پر شیروں کی تصویر شیر فلک پہ حملہ کر رہی تھی۔

پندار ہمان عہد است از دیدۂ فکرت بین
در سلسلۂ درگہ، در کوکبۂ میدان

اگر درگاہ کے تسلسل اور میدان میں نشان شہنشہی کو غور و فکر کی آنکھ سے دیکھے گا تو تو سمجھے گا کہ گویا وہی زمانہ (نظروں کے سامنے) ہے۔

از اسپ پیادہ شو بر نطع زمین نہ رخ
زیر پی پیلش بین شہ مات شدہ نعمان[1]

تو گھوڑے سے اتر اور فرش زمین پر اپنا سر رکھ تو تو دیکھے گا کہ نعمان جیسا بادشاہ ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلا ہوا ہے گویا شطرنج کے کھیل میں مات کھا گیا ہے۔

ای بس شہ پیل افگن کافگند بہ شہ پیلی
شطرنجی تقدیرش در ماتگہ حرمان

کتنے شہ زور اور پیل افگن بادشاہوں کو تقدیر کے شطرنج باز نے بدنصیبی کی مات گاہ میں شکست دے دی۔

مست است زمین زیرا خوردہ ست بجای می
در کاس سر ہرمز[2] خون دل نوشروان[3]

زمین مست ہے اس لیے کہ شراب کی جگہ اس نے ہرمز کے سر کے پیالے میں نوشروان کے دل کا خون پیا ہے۔

---

[1] نعمان بن منذر حیرہ کے مشہور فرمانرواؤں میں تھا۔ ۵۹۲ میں نوشیروان کے حکم سے بادشاہ مقرر ہوا، ۲۲ سال حکمرانی کی۔ خسرو پرویز کے زمانہ میں مورد عتاب ہوا، اور اسی بادشاہ کے حکم سے ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلوا دیا گیا، بقول معین خاقانی کے مندرجہ بالا شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، دیکھئے فرہنگ معین ج ۶، ص ۲۱۳۶ [2] ہرمز نام کے پانچ بادشاہ ساسانی دور میں گزرے ہیں ان میں دو یعنی چوتھا نوشیروان کا بیٹا تھا، ۵۷۹ میں تخت نشین ہوا (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰ پر)

بس پند کہ بود آنکہ در تاج سرش پیدا
صد پند نو است اکنون در مغز سرش پنہاں

اس کے تاج سر میں جو شہنشہی کی نشانی اس وقت تھی ایسی کتنی واضح نصیحتیں موجود تھیں اور اب (بعد مرگ) اس کے سر کے اندر سینکڑوں نئی نصیحتیں پنہاں ہیں جو غور کرنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

کسریٰ و ترنج زر، پرویز و تره زرین
برباد شده یکسر با خاک شده یکساں

نہ کسریٰ کا ترنج زر باقی ہے اور نہ خسرو پرویز کی سونے کی تره باقی رہ گئی، دونوں کل کی کل برباد ہو چکی ہیں اور زمیں کا پیوند ہو گئی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۹) ۵۹۰ میں ایک سردار کے بدست مقید ہوا اور اندھا کر دیا گیا۔ پانچواں ہرمزد خسرو پرویز کا بیٹا تھا ۶۳۱ء میں خود اس کے ایک محافظ نے قتل کر دیا (دیکھئے فرہنگ معین ج ۶، ص ۲۲۰۱) ۳۔ ساسانی خاندان کا ۲۱واں بادشاہ جس نے ۵۳۱ - ۵۷۸ء تک حکومت کی، اس نے فرمانروائے روم کو شکست دی اور حکومت کی بنیاد عدل پر قائم کی، نوشیروان عادل کی حیثیت سے اس کی شہرت عالمگیر ہے۔ حضرت سرور عالمؐ اسی بادشاہ کے زمانے میں مبعوث ہوئے، خاقانی کہتا ہے: پرویز ہدیٰ کہ در بلادش ۔ صد نعمان مرزبان ببینم (۲۴۵ حاشیہ صفحہ ہذا) ۴۔ کسریٰ معرب خسرو، خسرو نام کے تین فرمانروا ساسانی خاندان (۲۲۴ - ۶۵۲) میں گزرے ہیں، ان میں خسرو اول انوشیرواں اور خسرو دوم خسرو پرویز ہے خسرو پرویز نے ۵۹۱ تا ۶۲۸ء حکومت کی، نوشیرواں کے بعد ساسانی خانوادے کا سب سے مشہور بادشاہ تھا، اس نے بہت سی جنگوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اس نے اپنی فتوحات کے ذریعے بہت سے (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۱ پر)

پرویز بہر بومی زرین تره آوردی
کردی ز بساط زر زرین تره را بستاں

خسرو پرویز جہاں جاتا زرین تره لے جاتا اور بساط زر سے زرین تره کو بوستان بنا دیتا۔

پرویز کنوں گم شد زان گم شده کمتر گوی
زرین تره کو بر خوان، رو کم ترکوا برخواں

اب پرویز ختم ہو گیا اور گم شدہ کا ذکر بیکار ہے، زرین تره کہاں ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے پکارو تو جاؤ اور قرآن کی آیات پڑھو

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰) ذخائر حاصل کیے، وہ اپنے حرم سرا کے تجملات کے لیے شہرت رکھتا ہے، اقبال نے اس کو شہنشاہیت کا نشان قرار دیا ہے۔ خاقانی کے شعر میں کسریٰ کا پرویز سے الگ گیا، کسریٰ کو صاحب ترنج زر اور پرویز کو صاحب تره زرین بتایا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، خسرو پرویز ہی صاحب زر دست افشار یا مشت افشار ہے۔ زر دست افشار کے لیے نظامی کا شعر ملاحظہ ہو:

ملک را دو زر دست افشار در مشت کز افشردن بروں می شد ز انگشت (گنجینۂ گنجوی ص ۸۰)

زر مشت افشار کا ذکر بیرونی کے الجماہر ص ۲۴۳ میں آیا ہے اور مجمل التواریخ والقصص میں یہ جملہ ہے۔ [و خسرو پرویز را] بود زر مشت افشار کہ بر آن مہر نہادی و یہ سان موم بود۔ گرستنش، قطعہ زری بوزن ۲۰۰ مثقال (مشت افشار) بود کہ چون موم نرم بود و می توانست آنرا با شکال مختلف در آوردند۔ زر مشت افشار بودی بوشے اورا سبلت آورد و دوسرا پہ زر مشت افشار شد۔ ترنج زر اور طلائی دست افشار کا ذکر غالب کے ان دو اشعار میں دیکھئے،

تھا ترنج زر اک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار — پھینک دیتا طلائے دست افشار

دیوان مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ ص ۱۹۸۔

اور وہ لوگ (فرعون کا لشکر) ڈبو دیے
جادیں گے اور کتنے ہی باغ اور نہریں اور
کھیتیاں، عمدہ مکانات اور آرام کے سامان
جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے اور ہم
نے دوسری قوم کو ان کا وارث بنا دیا،
نہ توان پر آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ
انکو مہلت دی گئی۔ سورہ دخان (۲۵ - ۲۹)

گفتی کہ کجا رفتند آن تاجوران اینک
ز ایشان شکم خاک است آبستن جاویدان

تونے پوچھا کہ بڑے نامور بادشاہ کہاں چلے
گئے، ان کو زمین کھا گئی اور ہمیشہ کے لیے
وہ ان کے پیٹ میں سما گئے۔

بس دیر ہمی زاید آبستن خاک آری
دشوار بود زادن نطفہ ستدن آسان

زمین تاجوروں سے حاملہ ہے، بچہ پیدا ہونے
میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے، لیکن نطفہ
آسانی سے ماں کے پیٹ میں پڑ جاتا ہے۔

خون دل شیرین[1] است آں می کہ دہد رزبن
ز آب و گل پرویز است آں خم کہ نہد دہقان

انگورستان سے جو شراب نکلتی ہے وہ
دراصل شیریں کے دل کا خون ہے اور

---

[1] شیریں خسرو پرویز کی محبوبہ اور بیوی تھی جس پر فرہاد عاشق ہو گیا تھا۔ یہی افسانہ فارسی کی متعدد مثنویوں کا موضوع ہے، ان میں نظامی کی خسرو و شیریں اور امیر خسرو دہلوی کی شیریں و خسرو سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ مثنویوں کے علاوہ فارسی کی مشہور تلمیح ہے۔

وہاں وہ شراب کی خم تیار کرتا ہے دراصل
وہ پرویز کی آب و گل سے بناتا ہے۔

چندین تن جباران کاین خاک فرو خوردست
این گرسنہ چشم آخر ہم سیر نشد ز ایشان

نہ جانے کتنے بڑے بڑے جابر لوگ یہ
زمین کھا گئی ہے، لیکن اس کو بھوک کا
ایسا ہوکا ہے، جو اتنے لوگوں کے کھا جانے
کے بعد بھی اس کا پیٹ نہ بھرا۔

از خون دل طفلان سرخاب رخ آمیزد
این زال سپید ابرو وین مام سیہ پستان

یہ سپید ابرو بڑھیا، وہ بڑھیا ماں جسکی
پستان بہ نہ جانے کتنے بچوں کی حاملہ
ہونے سے سیاہ ہو چکی ہے، بچوں کے دل
کے خون سے اپنے چہرہ کے لیے گلگونہ بناتی ہے۔

خاقانی ازین درگہ دریوزہ عبرت کن
تا از در تو زین پس دریوزہ کند خاقان

اے خاقانی! تو ایوان مدائن کی عبرتناک
حالت سے عبرت حاصل کرتا کہ تیرے اس
بیان سے خاقان کو عبرت حاصل ہو۔

امروز گر از سلطان رندی طلبد توشہ
فردا ز در رندی توشہ طلبد سلطان

اگر آج کوئی رند سلطان توشے کا طلبگار
ہے تو کل سلطان رند سے توشہ پائے گا۔

گر زاد رہ مکہ توشہ است بہر شہری
تو زاد مدائن بر تحفہ ز پی شروان

اگر مکہ کی زاد راہ ہر شہر کے لیے تحفہ ہے
تو مدائن کا ساز و سامان (یعنی یہ مرثیہ)
اہل شروان کے لیے مناسب ہدیہ ہوگا۔

ہر کس برد از مکہ سبحہ ز گل حمزہ

ہر حاجی مکہ سے حمزہ کی قبر کی مٹی کی

پس تو ز مدائن بر تسبیح گِل سلمان

تسبیح لاتا ہے تو تو اے خاقانی! مدائن سے سلمان پارسی کی قبر کی مٹی کی تسبیح (اہلِ شروان) کے لیے لے جا۔

این بحرِ بصیرت بین بی شربت ازو مگذر
کز شط چنین بحری لب تشنہ شدن نتوان

اس بصیرت دیکھنے والے دریا سے بغیر اس کا پانی پیے چلے جانا مناسب نہیں، کیونکہ اس بحر کے شط سے لب تشنہ نہیں جانا چاہیے۔

خوان کہ ز راہ آیند آرند رہ آوردی
این قطعہ رہ آورد است از بہر دل اخوان

جب کوئی دوست سفر سے آتا ہے تو تحفہ لاتا ہے میرا یہ قطعہ تحفہ ہے، دوستوں کے دلوں کے لیے۔

بنگر کہ درین قطعہ چہ سحر ہمی راند
مفتون مسیح دل دیوانہ عاشق جان

غور کرنے کا ہے کہ اس قطعے میں شاعر نے کیسی سحر طرازی کی ہے، یہ قصیدہ مسیح دل پر مفتون اور عاشق جان کا دیوانہ ہے۔

(مصرعۂ ثانی مشکوک سا ہے)

ایران پر جب بھی مصیبت پڑی، خواہ یہ مصیبت بیرونی حملہ آوروں کے ظلم و ستم کے نتیجہ کے طور پر آئی، یا اندرونی خلفشار کی بنا پر، ملک جب مصائب سے دوچار ہوا تو ادیبوں، شاعروں کا قلم تیز تر ہو گیا اور انھوں نے ظلم و ستم کے خلاف موثر انداز میں آواز بلند کی، انوری اور خاقانی کے قصائد جن کو اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اسی خیال کے موید ہیں اواخر چھٹی صدی ہجری میں عراق پر سلجوقی حکمرانوں کا تسلط ختم

ہوا، خوارزمشاہ کے حملے کے نتیجے میں آخری سلجوقی بادشاہ طغرل بن ارسلان کا اقتدار جاتا رہا اور ۵۹۰ھ میں اس کو قتل کر دیا گیا، اس کے بعد عراق پر خوارزمیوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن نظم و نسق نہایت ابتر ہو گیا، سارا خطہ اتنی بدامنی کا شکار رہا کہ لوگوں کے لیے پناہ کی جگہ نہیں ملتی تھی، معاصر مورخ راوندی نے دردناک انداز میں وہاں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ظالم اور بد دینوں کا غلبہ ہوا، وہ مسلمانوں اور ائمہ دین پر طرح طرح سے ظلم کرتے، انکا بے وجہ خون بہاتے اور زبردستی مال چھینتے، کوڑے مار مار کر مسلمانوں سے روپیہ وصول کرتے، شراب خانے اور قحبہ خانے کھل گئے شراب خواری اور دوسرے مناہی پر کسی قسم کی پابندی نہ رہی، علماء پر اتنی سختی ہوئی کہ کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی اور ۵۹۸ھ میں پورے عراق میں علمی کتابیں، احادیث کے مجموعے، قرآن مجید کے نسخے ترازو میں تول کر فروخت ہوتے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ ایک من وزن کی کتابیں "نیم دانگ" میں بکتیں، مساجد اور مدارس بھی ظلم سے محفوظ نہ رہے، اس کے بعد لکھتا ہے کہ:

"جمال الدین محمد بن عبد الرزاق اصفہانی نے زمانہ اور اہل زمانہ کے حالات پر مشتمل ایک عمدہ قصیدہ لکھا ہے"

یہ قصیدہ گویا قومی مرثیہ ہے، اس کے منتخب اشعار مع ان کے ترجمے کے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:-

الحذار ای غافلان زین وحشت آباد الحذار
الفرار ای غافلان زین دیو مردم الفرار

اے غافلو اس وحشت آباد دنیا سے پرہیز کرو (بچو)، اے عقلمندو دنیا کے دیووں (ظالموں) سے بھاگو۔

ای عجب! لسان بنگرفت و نشد جان تان ملول
زین ہوا ہای عفن و بی آبہای ناگوار

اس بدبودار ہوا اور گندے پانی سے تمہارا دل پریشان نہ ہوا اور تمہاری جان ملول نہ ہوئی، بڑی حیرت کی بات ہے۔

مرگ در وی حاکم و آفات در وی بادشاہ
ظلم در وی قہرمان و فتنہ در وی پیشکار

موت یہاں حاکم ہے اور مصائب حکمران کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظلم قہرمان ہے اور فتنہ و فساد پیشکار کا کام کرتے ہیں۔

سر در و ظرف صداع و دل در و نطع بلا
گل در و اصل زکام و مُل در و تخم خمار

اس دنیا میں آدمی کا سر درد سر کے لیے اور اس کا دل بلا کی جگہ ہے، یہاں کے پھول زکام کے سبب اور یہاں کی شراب خمار کی بنیاد ہے۔

ماہ را ننگ محاق و مہر را نقص کسوف
خاک را عیب زلازل چرخ را رنج دوار

چاند سیاہی کے ننگ سے دوچار اور سورج گرہن کے نقص کا حامل ہوتا ہے، زمین زلزلے کے رخ پر ہے اور آسمان گردش کی مصیبت میں مبتلا ہے (غرض دنیا کی کوئی چیز نقص سے خالی نہیں)

مہر را خفاش دشمن شمع را پروانہ خصم
جہل را در دست تیغ و عقل را در پای خار

سورج کا دشمن الو، اور شمع کا مخالف پروانہ، جہل کے ہاتھ میں تلوار اور عقل کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا ہے۔

باز را با این ہنر یاد یدہ ہا بر دوختہ

دنیا کا عجیب و غریب دستور ہے کہ باز کی

کرگس خس طبع را بین از نعم دیدہ خوار

آنکھیں باوجود اس کے ہنروں کے سل دی گئی ہیں اور کمینہ طبع گدھ کی آنکھیں نعمت سے خوار ہو رہی ہیں۔

شیر را از مور صد زخم اینست انصاف جہان
پیل را از پشہ صد رنج اینست عدل روزگار

کیا دنیا کا تیرا انصاف یہی ہے کہ چیونٹی شیر کو زخم پہنچائے، کیا زمانے کے عدل کا یہی تقاضا ہے کہ ہاتھی کو مچھر بری طرح ستائے۔

چند سختی با برادر ای برادر نرم شو
تا کی آزار مسلمان ای مسلمان شرم دار

بھائی کے ساتھ اتنی سختی؟ اے بھائی! سخت گیری چھوڑ دے، نرمی اختیار کر، تو اپنے کو مسلمان کہتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی کہ تیرے ہاتھوں مسلمان کتنے مصائب کے شکار ہیں۔

قوت پشہ نداری جنگ با پیلان مکن
ہم دل موری نہ ای پیشانی شیران مخار

تجھ میں مچھر کی بھی قوت نہیں، ہاتھی سے ٹکر لینے کے خیال سے باز آیا، چیونٹی کی برابری نہیں کر سکتے، شیر سے بھڑنے کا ارادہ ترک کر دے۔

روی ہا گشتست بالعباس و دلہا بولہب
تا انکہ سرہا ذوالخمار است و زبانہا ذوالفقار

تیری صورت تو عالم دین کی سی ہے لیکن تیرا دل ظلم اور کینے سے آگ کی طرح دہک رہا ہے، تیرے سر میں بغاوت کی آگ بھری ہے اور تیری زبان ذوالفقار کی طرح تیز ہے۔

ظلم صورت می ببندد در قیامت گر نہ من

قیامت میں ظلم کی صورت نہ ہوگی ورنہ

گفتمی اینک قیامت منقد ودوزخ آشکار

میں یہ کہتا کہ یہی قیامت ہے اور اسی کا نام دوزخ ہے۔

آخر اندر عہد تو این قاعدت شد مستمر
در مساجد زخم چوب و در مدارس گیرودار

بالآخر تیرے عہد میں یہ قاعدہ مستقل طور پر جاری ہے کہ مساجد میں لوگوں کے کوڑے لگوائے جائیں اور مدارس میں طلبہ اور اساتذہ کی گیرودار جاری رکھی جائے۔

دین چو رای تو ضعیف و ظلم چون دستت قوی
امن چون نانت عزیز و عدل چون عرض تو خوار

جس طرح تیری رائے ضعیف ہے اسی طرح دین ضعیف ہو چکا ہے اور اس دور میں روٹی ایسی ہی کمیاب ہے جیسا امن اور انصاف بھی ایسا ہی ذلیل و خوار ہو رہا ہے جیسا کہ تیری عزت خوار ہے۔

جہد آن کن تا درین دہ روزہ عمر از بہر نام
صد ہزاران لعنت از تو باز کاند یادگار

کوشش کر کہ اس چند روزہ زندگی میں نام کے لیے ایسا نہ کر کہ ہزاروں لعنتیں تجھ پر باقی رہ جائیں۔

دین بدنیا می فروشی نیست بس سودی درین
باش تا تو در قیامت باز گیری این شمار

تو دین کو دنیا کے لیے بیچ رہا ہے لیکن یہ نفع کا سودا نہیں، ذرا انتظار کر، قیامت کے روز تیرے کیے کا بدلہ ملے گا۔

شیخ بو یحیی چگونہ واندت زد ہیچ زر
خواجۂ مالک چو نت داند سوخت چون عود قمار

ملک الموت سونے کی طرح کیونکر کوٹے گا (سختی موت کی طرف اشارہ ہے) اور مالک

جو داروغۂ دوزخ ہے کو عود قماری کی طرح کیونکر جلائے گا (جہنم کی آگ کی طرف اشارہ ہے)

وجہ مخفوری تو بیز بوریای مسجد است
وز مسلمانی خویش آخر نگردی شرمسار

تم مسلمان ہو، مسجد کی بوریا (فرش) بیچ کر اپنے گھر کے لیے قالین خریدتے ہو اور اپنے اس اسلام پر تم کو خجالت نہیں ہوتی، بڑی شرم کی بات ہے۔

اطلس و معلم خری از ریسمان بیوہ زن
دانگہی ناید ترا از خواجگی خویش عار

بیوہ زن جو رسی بٹ کر گزر بسر کرتی تھی، اس کو چھین کر اپنے لیے ریشم کے کپڑے خریدتے ہو، یہ خواجگی و سرداری قابل نفرین ہے۔

گر بدیبا ہای رنگین آدمی گردد کسی
پس درا اطلس جست گرگ و در عتابی سوسمار

اگر دیبا پہننے سے آدمی آدمی ہو جاتا، تو بھیڑ اطلس کے لباس میں گرگ اور گوہ عتابی کی پوست میں گوہ نہ رہتی۔

باش تا چون باز دارد صدمت یک نفخ صور
ہم زمین را از قرار و ہم فلک را از مدار

وہ دن دور نہیں جب صور کی ایک پھونک سے زمین میں بھونچال آئے گا اور آسمان اپنی جگہ سے ہٹ کر پھرنے لگے گا۔

خویشتن در صورت سگ باد آئی آن زمان
کز سر تو بر کشد مرگ این لباس مستعار
شد درازاین ترہات ای خواجہ کوتہ باز کن
کز سخن آن بہ کہ باشد در لباس اختصار

جب موت یہ لباس مستعار چھین لے گی تو اس وقت تو کتے کی صورت میں نمودار ہوگا۔
اے حضرت! یہ کوا اس بہت زیادہ ہو گیا اب ختم کرو، بات وہی بہتر ہے جو مختصر ہو۔

ای خدا پیوستہ دار امداد لطف و کرم — اے خدا! اپنے لطف و کرم سے ہمیشہ

تازہ دار ارواح ما را چو گل در نو بہار — ہماری روح کو اسی طرح تازہ رکھ جس طرح بہار میں پھول ہوتا ہے۔

اس کے بعد راوندی اضافہ کرتا ہے۔ شاعر ایلدگزیوں کے دور میں ہمدان میں تھا اور عراق کی حالت تو یہ ہے کہ عراق میں کوئی مسجد نہیں جس کی چٹائیاں ظالموں نے بیچ کر گھر کے لیے اعلیٰ درجے کا فرش نہ تیار کیا ہو اور کوئی بیوہ ایسی نہیں ہے کہ جس کی روئی چھین کر ریشمی کپڑے نہ مہیا کر لیے ہوں، ظلم و ستم کے مارے لوگ آوارہ پھر رہے ہیں اور ہزاروں قحط کی وجہ سے لقمۂ اجل ہو چکے ہیں" "معارف عراق در آفاق آوارہ اند و اہل اسواق بخود درماندہ و بیچارہ اند و چون حال بدین رسید و کار بدین انجامید بر جہانیان واجب است کہ بہ تضرع و ابتہال از ملک ذو الجلال درخواہند تا از آنجا کہ لطف اوست احیای دولت آل سلجوق بکند و بیخ ظلم از جہان برکند" راحۃ الصدور ۳۸۔

اب ہم سعدی کے مرثیۂ بغداد کا ذکر کریں گے۔ سعدی فارسی کے مشہور و مقبول شاعر (وفات ۶۹۲ھ) ہیں۔ خاقانی سے تقریباً ایک صدی بعد گزرے ہیں، انھوں نے منگول وحشیوں کا دور دیکھا تھا اور ان کے ہاتھوں اہل اسلام جن مصائب سے دوچار ہوئے ان کے وہ شاہد رہے ہیں، ۶۵۶ھ میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا، بغداد اسلام کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز تھا اور عباسی خلافت باوجود اس کے کہ اس کی ساری عظمت ختم ہو رہی تھی لیکن اس وقت بھی ساری دنیا کے مسلمان حکمراں عباسی خلفاء کی تہنیت اور خلعت کے منتظر رہتے تھے، یہ رہی سہی اسلامی عظمت کی نشانی ہلاکو کے ہاتھوں ختم ہوئی اور خلافت عباسیہ[1] کا

(حاشیہ ص ۲۶۱ پر)

آخری حکمراں[2] المستعصم باللہ اس وحشی منگولوں کے ہاتھوں بے دردی سے شہید ہوا، یہ امت مسلمہ کے لیے زبردست سانحہ تھا، اس اندوہناک واقعے سے سارا عالم اسلام دہل گیا۔ سعدی کی زندگی میں یہ لرزہ خیز واقعہ رونما ہوا، وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنے تاثرات کو ایک منظومہ کی شکل میں پیش کیا، جس کا ہر شعر دلی سوز و گداز کی جیتی جاگتی تصویر ہے، ذیل میں اس مرثیہ[3] کے اشعار مع ترجمے کے درج کیے جاتے ہیں، یہ مرثیہ کافی مشہور ہے اور عام طور پر پڑھے لکھے لوگ اس سے واقف ہیں، لیکن عام قاری واقف نہ ہوگا، اس لیے اس کو یہاں پیش کیا جاتا ہے:

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین — خلیفہ مستعصم باللہ کی خلافت کے خاتمے

بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین — پر اگر آسمان خون کے آنسو زمین پر برسائے تو وہ حق پر ہے۔

ای محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک — اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ قیامت کو اٹھیں گے

سر برآور وین قیامت در میان خلق بین — قیامت آگئی ہے، اٹھیے

(حاشیہ ص ۲۶۰) [1] خلافت عباسی کی بنیاد ۱۳۲ھ میں ابو العباس سفاح کے ہاتھوں پڑی اور ۵۲۴ سال تک یہ خلافت باقی رہی، عباسی خلفاء کے دوران خلافت علوم و فنون تہذیب و تمدن کی بڑی ترقی ہوئی، اسکو اسلام کا عہد زریں کہتے ہیں۔ [2] خلافت عباسیہ کا ۳۷واں اور آخری خلیفہ (۶۴۰-۶۵۶ھ) [3] دیکھیے کلیات سعدی ص ۶۷۴-۶۷۵ چاپ فروغی [4] غالب کا یہ شعر کیسی مناسبت رکھتا ہے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اور خلق کے درمیان قیامت ملاحظہ کریں۔

نازنینان حرم را خون خلق بے دریغ
ز آستان بگذشت و ما را خون چشم از آستین

حرم کے نازنینوں کا جو خون بے دریغ بہایا گیا، وہ
آستان سے آگے بڑھ گیا ہے اور ہماری آنکھوں
سے موجِ خوں ابل رہا ہے۔

زینہار از دورِ گیتی انقلاب روزگار
در خیال کس نیامد کانچنان گردد چنین

دورِ گیتی اور انقلاب روزگار سے پناہ
مانگتا ہوں۔ کسی کے خواب و خیال میں نہیں
آسکتا تھا کہ ایسی بلندی اتنی پستی میں بدل جائیگی۔

دیده بردار ای که دیدی شوکت باب الحرام
قیصران روم سر بر خاک و خاقانان چین

اے حضرت رسول ذرا آنکھ کھول کر آپ
دیکھیں تو، آپ نے تو باب الحرام کی عظمت و
شوکت دیکھی تھی، جہاں قیصر روم اور خاقان
چین بڑی خاکساری سے بیٹھا کرتے تھے۔

خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ
هم بر آن خاکی کہ سلطانان نهادندی جبین

حضرت محمد مصطفیٰؐ کے بیٹوں کا خون اسی
خاک پہ بہایا گیا، جہاں بڑے بڑے بادشاہ
سجدہ کیا کرتے تھے۔

وه کہ گر بر خون آن پاکان فرو آید مگس
تا قیامت در دهانش تلخ گردد انگبین

سمجھ لو اگر ان پاک شہیدوں کے خون پہ
مکھی بیٹھے تو پھر اس کا اثر یہ ہوگا کہ قیامت
تک مکھی کا منہ کا مزہ تلخ ہی رہے گا۔

بعد ازین آسایش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگین

اس کے بعد اب دنیا میں آسائش کا تصور
بے معنی ہے؟ عام بات یہ ہے کہ جیسے انگوٹھی کا

نگینہ گر جاتا ہے تو انگوٹھی میں صرف قیر ہی
باقی رہ جاتا ہے۔

دجلہ خونابست ازین پس گر نهد سر در نشیب
خاک نخلستان بطحا را کند در خون عجین

دجلہ خون آلود ہے، اگر نیچے کی طرف یہ
دریا بہا تو بخوبی ممکن ہے کہ مدینے کا نخلستان
خون میں ڈوب جائے۔

روی دریا درهم آمد زین حدیث هولناک
می توان دانست بر رویش ز موج افتاده چین

اس ہولناک واقعہ سے دریا بھی متاثر
ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس کا چہرہ چیں بجبیں
ہے، موجیں اس کی نشانی ہیں۔

گریہ بیهوده است و بیحاصل بود شستن بآب
آدمی را حسرت از دل اسپ را داغ از سرین

رونا بیکار ہے، سب کو معلوم ہے آدمی کے
دل رنج و الم کا اور گھوڑے کے داغ کا
دھنا بے حاصل ہے۔

نوحہ لایق نیست بر خاک شهیدان زانکه هست
کمترین دولت مر ایشان را بهشت برترین

شہیدوں پر رنج و غم کرنے کا موقع نہیں،
وہ عزت اور دولت وہ سرا ہی انکی کمترین
دولت بہشت بریں ہے۔

لیکن از روی مسلمانی و کوی مرحمت
مهربان را دل بسوزد بر فراق نازنین

لیکن دوست کا دل دوست کی جدائی میں
کڑھتا ہے، یہ مسلمانی اور مرحمت کا تقاضا ہے۔

باش تا فردا کہ بینی روز داد و رستخیز
وز لحد با زخم خون آلوده برخیزد دفین

کل جب قیامت کا دن، انصاف کا دن ہوگا،
تو قبر سے مردے خون آلود زخم کے ساتھ
نکلیں گے۔

بر زمین خاک قدمشان توتیای چشم بود
روز محشر خوں نشان گلگونہ حوران عین

دنیا میں ان کے قدم کی خاک آنکھوں کیلئے توتیا کا کام دیتی ہے قیامت کے دن ان کا خون حوروں کے لیے گلگونہ ہوگا۔

قالب مجروح اگر در خاک و خون غلطد چہ باک
روح پاک اندر جوار لطف رب العالمین

اگر مجروح دل خاک و خون میں لتھڑا ہوا ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں، روح پاک تو رب العالمین کی مرحمت کے جوار میں ہے۔

تکیہ بر دنیا نشاید کرد و دل بر وی نہاد
کاسمان گاہی بہ مہر است ای برادر گہ بکین

دل پر بھروسہ کرنا چاہیے اور نہ اس سے دل لگانا چاہیے، اس لیے کہ اے بھائی آسمان کبھی مہربان ہے تو کبھی کینہ پرور۔

چرخ گردان بر زمین گوئی دو سنگ آسیاست
در میان ہر دو روز و شب دل مردم طحین

یہ گردش کرنے والا آسمان زمین پر چکی کے دو پاٹ کی طرح ہے، ان دونوں کے درمیان آدمی کا دل دن رات پسا جاتا ہے۔

زور بازوی شجاعت بر نتابد با اجل
چون قضا آمد نماند قوت رای رزین

بہادری کے زور بازو سے اجل کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، جب موت آجاتی ہے تو آدمی کی صائب رائے بیکار ہو جاتی ہے۔

تیغ ہندی بر نیاید روز پیکار از نیام
شیر مردی را کہ باشد مرگ پنہاں در کمین

اس شیر مرد کی تیغ ہندی لڑائی کے موقع پر نیام سے نکلتی ہی نہیں، جس کی موت گھات میں چھپی ہوتی ہے۔

تجربت بیفایدہ است آنجا کہ برگردید بخت

جب قسمت پھر جاتی ہے تو تجربہ سے کوئی

حملہ آوردن چہ سود آنرا کہ برگردید زمین

فایدہ نہیں، جس کی زمین ہی پلٹ گئی ہو تو اسکا حملہ کرنا بیکار رہتا ہے۔

گو کسانند از پی مردار دنیا جنگجوی
ای برادر گر خردمندی چو سیمرغ ان نشین

بہت سے لوگ اس مردار دنیا کے لیے لڑائی میں مشغول ہیں، اے بھائی، اگر تو عقلمند ہے تو سیمرغ کی طرح دنیا سے الگ تنہائی میں زندگی گذار۔

ملک دنیا را چہ قیمت حاجت نیست از خدای
گو نگہ دارد بسایہ ملک ایمان و یقین

دنیاوی دولت کی کوئی قیمت نہیں، خدا سے یہ دعا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ایمان و یقین کی حکومت پر قائم رکھے۔

بغداد کا مرکز ہلاکو کے ہاتھوں ۱۲۵۸ء میں اجڑ گیا، لیکن ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ یہ وحشی دین مبین کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ ہلاکو کی وفات ۱۲۶۴ میں ہوئی، اس کے ۱۷ برس بعد اس کا بیٹا تکودار تخت نشین ہوا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام کی تبلیغ کی طرف متوجہ ہوا، کچھ ہی دن بعد وہ قتل کر دیا گیا، اس کے ۱۳ سال بعد غازان خان ایلخانی تخت پر بیٹھا، وہ زبردست مبلغ اسلام تھا، اس نے اسلام کی تبلیغ میں بڑا کام کیا۔ اس کا ایک خط جو حضرت بہاء الدین ملتانی کے پوتے کے نام ہے اور جس کو راقم الحروف نے اورینٹل کالج میگزین (اسید عبد اللہ نمبر) میں شایع کیا، اشاعت اسلام کے سلسلے میں اس کے طریقہ کار کا نمایندہ ہے۔ ۷۰۳ / ۱۳۰۳ء میں اس کی وفات ہوئی، اس کے بعد خدا بندہ (م ۱۳۱۶) اور ابو سعید (م ۱۳۳۶) ایلخانی تخت پر بیٹھے اور اسلام کی اشاعت کرتے رہے، اقبال نے خوب لکھا ہے:

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اسفرائن کے دو شافعی فقیہ

امام ابو اسحاق اسفرائینی و امام ابو حامد اسفرائینی

از عبد الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

خراسان کی بستی اسفرائن[1] کی خاک سے ایسی متعدد ہستیاں اٹھیں جن کی وجہ سے اسفرائن کا نام اسلام کی علمی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو گیا، ان میں امام ابو اسحاق اسفرائینی اور امام ابو حامد اسفرائینی خاص طور پر اس لیے قابل ذکر ہیں کہ ان کے بغیر فقہائے شافعیہ

[1] اسفرائن کے متعلق معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ نیشاپور سے جرجان کے راستہ میں ٹھیک نصف فاصلہ پر ہے، امام سمعانی نے لکھا کہ یہ چھوٹا سا شہر ہر دور میں بڑا مردم خیز رہا ہے، یاقوت حموی کے الفاظ میں چھوٹا ہونے کے باوجود مضبوط و مستحکم شہر ہے، نام کے سلسلے میں ایک روایت یہ ہے کہ یہاں کے باشندے اپنے ساتھ ایک سپر رکھتے تھے اسی لیے اس بستی کو "سپرائین" کہا گیا، لیکن اس کا مشہور قدیم نام مہرجان ہے، کسی بادشاہ نے یہاں کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر یہ نام رکھا تھا، ہو سکتا ہے یہ بادشاہ اسفندیار ہو جس نے اسے اپنے نام پر بسایا تھا، کہتے ہیں کہ بعد میں بدلتے بدلتے یہ اسفرائن ہو گیا، ساتویں صدی ہجری میں اسے مغلوں نے تباہ کیا اور گیارہویں صدی ہجری میں ازبکوں نے اسے تاراج کیا، یہاں کے باشندے عموماً فقہ شافعی پر عمل پیرا تھے، یہاں کے اور نامور وں میں ابو عوانہ یعقوب بن اسحٰق (۳۱۶ھ)، محمد بن علی ابو علی (۳۶۳ھ) اور مشہور ماہر فلکیات (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۷ پر)

کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں کہا جا سکتا، امام ابو اسحٰق اگر قاضی ابو الطیب طبری، امام ابو القاسم قشیری اور امام بیہقی جیسے ائمہ وقت کے استاد اور علوم فقہ و کلام میں امام زمانہ ہوئے تو امام ابو حامد کی شان اس سے ظاہر ہے کہ ان کو شافعی ثانی کہا گیا، ذیل میں ان دونوں نامور فقیہوں کے سوانح کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

امام ابو اسحٰق اسفرائینی

امام صاحب کا پورا نام و نسب اس طرح ہے، ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن مہران، رکن الدین لقب اور ابو اسحٰق کنیت ہے، وطنی نسبت اسفرائینی ہے اور اسی سے وہ مشہور ہوئے۔

تعلیم و تربیت ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں تاریخ ولادت کا بھی ذکر نہیں ملتا، مگر بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق ۴۱۸ھ میں جب ان کا انتقال ہوا تو عمر تقریباً ۹۰ برس کی تھی[1]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۳۲۸ھ کے کچھ پہلے پیدا ہوئے، حصول تعلیم کے سلسلہ میں بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں، مگر نیشاپور کے قریب ہونے اور وہاں کے علماء سے اکتساب علم کی وجہ سے گمان غالب ہے کہ وہ جلد ہی نیشاپور گئے اور امام ابو بکر اسماعیلی اور ان کے معاصر علمائے حدیث و فقہ سے تعلیم حاصل کی[2]، بعد میں مزید تعلیم کے لیے عراق کا سفر کیا اور وہاں امام ابو بکر محمد بن

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۶) عصام الدین فلکی (۵۳۶ھ) بھی ہیں، ان کے علاوہ روایت یہ بھی ہے کہ نوشیرواں عادل بھی یہیں پیدا ہوا تھا، محمود غزنوی کے مربی ابو العباس فضل بن احمد بھی اسی شہر کے فرزند تھے (روضات الجنات: ص ۴۴)، [1] شذرات الذہب ج ۳، ص ۲۱۰ [2] طبقات کبریٰ، سبکی ج ۳، ص ۱۱۱۔

عبداللہ شافعی اور امام ابو محمد دعلج بن احمد سجزی اور ان کے ہم عصر چند اور علماء و فقہاء سے اکتساب فیض کیا، ان کے علاوہ جن اور علماء سے انہوں نے استفادہ کیا ان میں ابوبکر محمد بن یزداد، ابو جعفر محمد بن علی جبرسقانی اور ابو احمد محمد بن احمد غطریفی وغیرہ کے نام بھی تذکروں میں ملتے ہیں[۱]۔ عراق میں انہوں نے طالب علمی کا جو وقت گزارا وہ اس درجہ کامیاب رہا کہ بقول سمعانی "انہوں نے وہ سب حاصل کر لیا جو دوسرے نہ کر سکے تھے"[۲] چنانچہ جب وطن واپس آئے تو اس وقت عراق و خراسان دونوں علاقوں کے علماء و فضلاء ان کی فضیلت اور اولیت کے معترف ہو چکے تھے[۳]۔

نیشاپور میں قیام | عراق سے واپس ہوئے تو مستقل قیام کی غرض سے وطن ہی کا انتخاب کیا اور یہیں قاضی ابو الطیب طبری نے ان سے اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی، بعد میں طبری نے ایک فقیہ اور امام اسفرائینی کے خاص شاگرد کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی[۴] لیکن وطن میں امام اسفرائنی کے قیام کی مدت اس لیے مختصر ہی کہ اہل نیشاپور مصر تھے کہ وہ نیشاپور میں ہی قیام کریں، نیشاپور کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خواہش کا مسلسل اظہار کرتے رہے آخر جب اصرار زیادہ ہوا تو نیشاپور تشریف لے گئے[۵] اور پھر تا دم آخر وہیں رہے۔

مدرسہ نیشاپور | ان کے سوانح میں یہ بات بڑے فخر کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ نیشاپور میں ان کے لیے خاص طور سے ایک مدرسہ بنایا گیا تھا، یہ اس شان کا تھا کہ کم از کم نیشاپور میں اس سے پہلے کوئی اور ایسا مدرسہ نہیں بنا تھا اسی میں انہوں نے

---

۱ طبقات کبریٰ سبکی و تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۴۲ ۲ انساب ج ۱ ص ۳۴ ۳ ایضاً ۴ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۷، تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۶۹ و طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۵۸۔

حدیث و فقہ کا درس دیا، نیشاپور میں مسجد عقیل نامی ایک مسجد تھی اس میں بھی ان کی ایک خاص مجلس صرف حدیث کے املا کے لیے منعقد ہوتی[۱]، اس میں سب سے پہلے انہوں نے محرم ۴۱۱ھ میں حدیث کا املا کرایا، تذکروں میں اس حدیث کا بھی ذکر ہے جس سے انہوں نے اپنا درس املا شروع کیا تھا: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت علی اثر ثمانیۃ آلاف نبی، منہم اربعۃ آلاف من بنی اسرائیل[۲]۔

تلامذہ اور رواۃ | ان کے شاگردوں میں ان کے سوانح نگاروں کے مطابق خراسان اور خاص طور پر نیشاپور کے بے شمار لوگ ہیں، مگر خود ان کے لیے باعث فخر و ناز شاگردوں میں امام بیہقی، امام ابو القاسم قشیری اور قاضی ابو الطیب طبری جیسے نامور محدثین و فقہاء ہیں، قاضی طبری نے علم کلام و اصول حدیث میں خاص طور پر ان سے فیض حاصل کیا، امام قشیری ان کی مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور امام بیہقی کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ وہ ان کی کتابوں کے سب سے بڑے راوی ہیں[۳]، ان ائمہ کے علاوہ ابو القاسم ہبۃ اللہ بن ابی الصہباء اور محمد بن ابی الحسن ہالوی کا شمار بھی ان کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے۔

علوئے مرتبت | ان کے درجہ بلند کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے، ابن خلکان نے الاستاذ اور سمعانی نے استاذ امام کے الفاظ سے ان کو یاد کیا ہے، امام حاکم ابو عبداللہ ان کے بزرگ معاصرین میں ہیں اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ ابو اسحٰق فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کے ایسے عالم ہیں جنھیں دست سبقت حاصل ہے[۴]۔ امام ذہبی اور قاضی

---

۱ انساب بحوالہ سابقہ ۲ طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۱۱۳، ۱۱۲ ۳ وفیات ج ۱ ص ۶ ۴ طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۵۸ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۰۹۔

ابن شہبہ نے ان کو شیخ اہل خراسان لکھا[1]۔ امام یافعی نے ان کی شان میں الامام الکبیر، الاستاذ الشہیر اور احد الاعلام جیسے القاب استعمال کیے[2]۔ امام نووی نے یہ قول نقل کیا کہ استاذ ابو اسحٰق کا شمار ان علماء میں ہے جو درجۂ اجتہاد پر فائز تھے، علوم نقلیہ میں انکو تبحر حاصل تھا اور امامت کی تمام شرائط عربیت، فقہ، کلام، اصول اور معرفت کتاب و سنت ان میں موجود تھیں[3]۔ خود امام نووی کا قول ہے کہ استاذ اسفرائنی کے ہم عصر دو اور علماء تھے اور ان تینوں نے حدیث و سنت کے کلامی مسائل میں مسلک اشاعرہ کو تقویت پہنچائی باقی دونوں علماء امام ابوبکر باقلانی صاحب اعجاز القرآن و اسرار الباطنیہ اور امام ابوبکر بن فورک ہیں[4]۔ صاحب ابن عباد اپنے مسلک اعتزال کی وجہ سے ان تینوں کے مخالف تھے لیکن علم و فضل کے قائل تھے، ایک موقع پر انھوں نے ان تینوں کی صفات یوں بیان کی کہ باقلانی بحر مغرق (بحر بیکراں) ابن فورک صل مطرق (باران بے پایاں) اور اسفرائنی نار محرق (آتش سوزاں) ہیں[5]۔

امام سبکی نے بھی ان کو الاستاد اور علم کلام، اصول و فروع کے امام اور جامع العلوم کی حیثیت سے یاد کیا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا کہ تمام ائمہ ان کی تعظیم و تکریم پر متفق ہیں اور ان میں امام کی جملہ شرائط پائے جانے کے معترف ہیں، یہ بھی لکھا کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے[6]۔ ابن ہدایہ نے مذکورہ صفات کے ساتھ امام لغات اور متقی کا اضافہ کیا[7]۔ ابو عمرو بن الصلاح نے لکھا کہ استاذ ابو اسحٰق نے اصول فقہ میں فقہائے شافعیہ کے

---

[1] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۰۵ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۰۹ و العبر ج ۳، ص ۱۲۸ [2] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۳۱ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۱۶۹ [4] ایضاً [5] طبقات کبری و ابن شہبہ بحوالہ سابق [6] طبقات کبری [7] طبقات ابن ہدایہ ص ۴۵۔

مسلک کو بڑی تقویت دی، لیکن چند مسائل ان فقہاء کے لیے خاصے پیچیدہ اور مشکل تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے ان مسائل میں امام شافعی کی موافقت اور تائید سے پہلو تہی کی تھی، مگر استاذ ابو اسحٰق نے ان فقہاء کے اصولوں ہی کی روشنی میں ان مسائل کو حل کیا، ان میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کیا قرآن کے حکم کو سنت کے ذریعہ منسوخ کیا جاسکتا ہے؟ ایک بحث یہ بھی تھی کہ جب ایک ہی مسئلہ پر مجتہدین میں تعدد آراء کے ساتھ تضاد آراء بھی ہو تو راہ صواب پر ایک ہی مجتہد ہوگا، بخلاف اس قول کے کہ ہر مجتہد مصیب ہے خواہ ان میں سے کوئی غلط استدلال اور قیاس باطل پر ہو اور کوئی زندیق ہو، اس قول میں جو ابہام ہے وہ مخفی نہیں، لوگوں نے اس کو امام شافعی کی جانب منسوب کیا تھا، اس وجہ سے بعض پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں، امام اسفرائنی نے ثابت کیا کہ امام شافعی سے اس قول کی نسبت درست نہیں[1]۔ امام اسفرائنی کی شان میں امام عبدالغافر کا یہ قول بھی نقل کرنے کے لائق ہے کہ وہ صرف نیشاپور کے لیے ہی نہیں پورے مشرق کے لیے مایۂ ناز و افتخار تھے[2]۔

زہد و تقویٰ علم کی دولت کے ساتھ وہ عمل کی نعمت سے بھی بہرہ یاب تھے، انکے کمالات علمی کے جلو میں ان کی عبادت، ریاضت، تقویٰ اور انابت کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ امام نووی نے لکھا کہ وہ عابد و زاہد اور تقویٰ و پرہیزگاری میں حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے، انھوں نے ان کی صفات میں آخری بات یہ کہی کہ امام ابو اسحاق کے فضائل و کمالات کے بیان کے لیے کئی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہے[3]۔

سفارت ایک روایت کے مطابق خلیفہ عباسی نے ان کو ملک روم کے پاس نمائندہ

---

[1] تہذیب الاسماء بحوالہ سابق [2] طبقات کبری و وفیات ج ۱ ص ۶ [3] تہذیب الاسماء۔

بنا کر بھیجا تھا، لیکن اس سلسلہ میں تفصیلات نہیں ملتیں، صاحب روضات الجنات نے یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جائے مگر ہماری نظر سے یہ واقعہ کہیں نہیں گزرا۔

تصنیفات ان کی تصنیفات کا ذکر بھی تذکروں میں اہمیت کے ساتھ کیا گیا ہے، قاضی ابن شہبہ نے ان کو کثیر التصانیف لکھا اور ابن خلکان اور امام یافعی نے انکی کتابوں کو جلیل القدر کہا، امام سبکی نے بھی انکی تالیفات کو اعلیٰ درجہ کی بتایا، مگر ہم ان کی چند کتابوں کے ہی ناموں سے واقف ہو سکے، ان کی سب سے اہم کتاب جس کا ذکر قریباً ہر تذکرہ نگار نے کیا ہے وہ جامع الحلی فی اصول الدین والرد علی الملحدین ہے، ابن خلکان نے اسی نام کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی پانچ جلدیں دیکھی تھیں[1]، علامہ چلپی نے اس کا پورا نام جامع الجلی والخفی فی اصول الدین والرد علی الملحدین لکھا ہے[2] اس کے علاوہ اصول فقہ میں ان کے ایک رسالہ کا ذکر ملتا ہے جو دراصل امام ابن الحداد کی کتاب الفروع کی شرح اور تعلیق ہے، اس سے پہلے اس کی ایک شرح امام قفال شاشی نے لکھی تھی، بعد میں قاضی ابو الطیب طبری، امام نورانی اور امام صیدلانی نے بھی اس کی شرحیں لکھیں[3]، ایک اور کتاب کا ذکر بھی آتا ہے جس کی تخریج حاکم ابو عبد اللہ نے دس حصوں میں کی تھی[4] مگر اس کتاب کا اصل نام کسی نے نہیں لکھا۔

مناظرے دوسرے کمالات اور علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ ہی امام ابو اسحٰق کے

[1] وفیات [2] کشف الظنون ج ۱ ص ۳۶۱ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۰۹۔

مناظروں کا ذکر بھی ملتا ہے، عموماً ان کے مناظرے معتزلہ سے ہوئے، امام سبکی نے مشہور معتزلی قاضی عبد الجبار سے ان کے ایک مناظرہ کے حال کو مختصراً نقل بھی کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنزیہہ باری تعالیٰ، مشیت، جبر، قضا جیسے مسائل پر ہی یہ مناظرے برپا ہوتے تھے۔

وفات نیشاپور میں طویل قیام کی وجہ سے ان کو اس شہر سے خاص الفت ہو گئی تھی، ایک بار فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ آخری بار اپنی آنکھیں یہیں بند کروں، تاکہ یہاں کے باشندے میری نماز جنازہ میں شریک ہوں، ٹھیک پانچ مہینوں کے بعد انکی یہ آرزو پوری ہوئی، عاشورا کے روز ۴۱۸ھ میں وہ اپنے رسالہ سے جا ملے، اس دن بارش ہو رہی تھی، ظہر کے بعد سورج نکل آیا، مقبرہ حیرہ میں امام موفق نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر ابو بکر طوسی کے قبرستان میں تدفین ہوئی، بعد میں انکے صاحبزادے اسفرائن کے باشندوں کی بڑی جمعیت کے ساتھ آئے، ان کو اصرار تھا کہ امام صاحب کی آخری آرام گاہ اسفرائن ہی میں ہو، چنانچہ تیس دن کے بعد میت کو پھر قبر سے نکالا گیا اور اسفرائن کے آبائی قبرستان میں دوبارہ تدفین ہوئی[1] امام سمعانی متوفی ۵۶۲ھ نے ان کی قبر کی زیارت کی تھی، مشہور تھا کہ امام ابو اسحٰق کی قبر کے پاس دعائیں قبول ہوتی ہیں[2]

وفات کے وقت عمر قریباً ۹۰ برس یا کچھ زیادہ تھی[3]

مسائل امام سبکی نے ان کے بعض اقوال ومسائل نقل کیے ہیں جن کا تعلق اہل الحق

[1] تہذیب الاسماء، وفیات، شذرات اور انساب بحوالہ سابق [2] انساب بحوالہ سابق [3] شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۱۰۔

سے ہے، امام نووی نے بھی ایک دو مسئلے نقل کیے ہیں، بعض کتب فقہیہ میں کہیں کہیں ان کے چند تفردات کا ذکر ہے اور یہی ان کا معلوم علمی متروکہ ہے، ممکن ہے کہیں سے ان کے کسی مخطوطہ کی دریافت کی خبر آجائے تو انکی تحقیق و ترتیب سے بعض امور سامنے آئیں۔

امام ابو حامد اسفرائینی

شیخ العراق، صدر نشین مسند فقہائے عراق، مرکز نجابت و شرافت اور یکتائے زمانہ امام ابو حامد اسفرائینی کی شان اسی سے ظاہر ہے کہ ان کو شافعی ثانی کہا گیا۔

نام و نسب | ان کا پورا نام و نسب اس طرح ہے: احمد بن ابی طاہر محمد بن احمد، ابو حامد کنیت ہے اور اسی سے وہ مشہور ہوئے[1]، اسفرائینی نسبت وطنی ہے اور یہ انکے نام کا ایسا جزء ہوئی کہ جب مطلق اسفرائینی لکھا جاتا ہے تو امام ابو حامد اسفرائینی ہی مراد ہوتے ہیں[2]۔

ولادت اور تعلیم | وہ ۳۴۴ھ/۹۵۵ء میں اسفرائن میں پیدا ہوئے[3]، ابتدائی تعلیم کی تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے سترہ[17] برس کی عمر میں پہلا فتویٰ دیا تھا[4]، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم شروع سے عمدہ اور اعلیٰ خطوط پر ہوئی، اسفرائن کی بستی اہل علم و فضل سے معمور تھی، اس لیے حصول علم میں دشواریاں بھی حائل نہ ہوئی ہوں گی، مشہور محدث ابراہیم بن محمد بن عبدک[1] کا قیام مستقلاً وہیں تھا،

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات: نووی ج ۲ ص ۲۰۸ [2] روضات الجنات: محمد باقر موسوی خوانساری ص ۵۳ [3] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱ [4] ابن خلکان نے عبدل لکھا ہے، وفیات ج ۱ ص ۳۳۔

روایتوں سے ظاہر ہے کہ ان سے امام اسفرائینی نے سماعت و روایت حدیث کی[1]۔

بغداد میں آمد | ابن اثیر نے لکھا کہ وہ کم عمری میں بغداد آئے[2]۔ العبر کے الفاظ میں وہ بچپن میں بغداد آئے[3]، یہی الفاظ ابن عماد کے بھی ہیں[4]، سمعانی و ابن الجوزی کے بقول وہ نوجوانی میں آئے[5] اور امام سبکی کے الفاظ میں وہ جوانی میں بغداد تشریف لائے[6] اور یہی زیادہ واضح قول ہے کیونکہ خود امام اسفرائینی نے ایک موقع پر کہا کہ "میں ۳۴۴ھ میں پیدا ہوا اور ۳۶۴ھ میں بغداد آیا"[7]، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بیس[20] برس کی عمر میں بغداد آگئے تھے۔

حصول تعلیم | ان کے خاص شاگرد امام سلیم[8] بن ایوب رازی نے ان کے حالات میں لکھا کہ انھوں نے اپنی تعلیم پر بہت توجہ دی، شروع میں معاشی حالت سقیم تھی اسلئے ایک گھر کی دربانی کی خدمت انجام دی اور اسی ملازمت کے دوران وہ اپنے شوق علم کی پاسبانی بھی کرتے رہے، راتوں کو وہ چوکیداری کرنے کے ساتھ دروازہ پر رکھے ہوئے چراغ کی روشنی میں اسباق کا مطالعہ کرتے اور پاسبانی کی اجرت سے ضروریات زندگی کو پورا کرتے، وکان یحرس فی درب وکان یطالع الدرس علی زیت الحارس[9] ویاکل من اجرۃ الحرس[10]۔

اساتذہ | انہوں نے فقہ کی تعلیم مشہور فقیہ امام ابو الحسن علی بن احمد ابن المرزبان

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۸ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲ [3] العبر فی خبر من غبر ج ۳ ص ۹۳ [4] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۸ [5] انساب ج ۱ ص ۴۳ [6] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۵ [7] معجم البلدان ج ۱ ص ۲۲۹ المنتظم ج ۷ ص ۲۷۷ [8] صاحب روضات الجنات نے سلیمان بن ایوب لکھا جو صحیح نہیں ہے ص ۸۴ [9] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۶ [10] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰۔

بغدادی سے حاصل کی، لیکن یہ مدت بڑی مختصر رہی کیونکہ ۳۶۶ھ ہی میں شیخ ابن المرزبان کا انتقال ہوگیا، ان کے بعد انہوں نے دوسرے امام وقت ابوالقاسم عبدالعزیز بن عبداللہ دارکی (م ۳۷۵ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے اور نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کیں ولم یزل یترقی به الاحوال[1]۔ ان کے علاوہ انہوں نے بغداد کے اور فقہاء اور ائمہ سے بھی تعلیم حاصل کی[2]۔ علم کی جستجو اور اس میں انہماک ان کی زندگی تھی، انہوں نے یکسو ہوکر اپنے شیوخ سے اس طرح استفادہ کیا کہ تنگی داماں کی شکایت نہ رہی، وہ خود فرماتے تھے کہ جب بھی کسی علم و نظر کی مجلس سے اٹھا تو یہ احساس نہ ہوا کہ جو کچھ مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا وہ یاد نہ رکھ سکا[3]، علوم حدیث میں انہوں نے امام ابن عبدک اسفرائنی کے علاوہ امام عبداللہ بن عدی، امام ابوبکر اسماعیلی جرجانی، امام ابوالحسن دارقطنی سے اکتساب فیض کیا، گو انہوں نے احادیث کی روایت کم کی ہے[4] مگر علوم حدیث میں بھی اس درجہ کو پہنچے کہ امام اصحاب حدیث کہلائے[5]۔

جلالت شان نامور محدثین و فقہاء سے استفادہ کے بعد وہ علم و فضل کے اس مقام بلند پر فائز ہوئے کہ ان کو یکتائے روزگار کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا حتی صار اوحد وقتہ[6] وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز اور سب کا مرجع و ماوی بن گئے[7]۔ شیخ ابواسحق شیرازی نے لکھا کہ مکتب شافعی کی ریاست ان پر ختم تھی[8]، دین و دنیا کی جامعیت و ریاست کا

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲ [2] طبقات، ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱ [3] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۳، [4] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۹ [5] روضات الجنات ص ۸۴ [6] انساب ج ۱ ص ۴۳ [7] روضات الجنات ص ۸۴ [8] طبقات شیرازی ص ۱۰۳۔

تذکرہ تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے[1] امام سبکی نے انکا ذکر شیخ طریقہ العراق، حافظ المذہب، امام مذہب، علم کا کوہ رفیع اور امت کے جید ترین عالم وغیرہ جیسے پرشکوہ الفاظ و تعبیرات سے کیا ہے[2]۔

عوام و خواص اور علماء و ملوک سب کی نظروں میں وہ صاحب وجاہت تھے بلکہ خطیب بغدادی کے الفاظ میں ان کا رعب و دبدبہ بڑی شان کا تھا[3]۔ انکی وجاہت اور دبدبہ و شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک بار انھوں نے خلیفہ وقت کو لکھا کہ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس منصب جلیل پر فائز کیا ہے اس سے آپ مجھے معزول نہیں کر سکتے، جبکہ مجھے یہ طاقت بخشی گئی ہے کہ میں خراسان سے چند الفاظ لکھ کر آپ کو خلافت کے عہدہ سے سبکدوش کر سکتا ہوں[4]۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ وہ جلیل و نبیل تھے[5]۔ امام نووی کی رائے یہ ہے کہ امام اسفرائنی ہی سے عراق کے شوافع کے مسلک کو فروغ عام حاصل ہوا[6]۔ امام یافعی نے امام الجلیل الفاضل کے الفاظ کے علاوہ مقرر النجابة والفضائل (نجابت و شرافت اور خوبیوں کے مرکز) کے توصیفی الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا[7]۔ اپنے زمانہ میں احناف کے امام اور نامور فقیہ امام ابوالحسین قدوری ان کے ہم عصر تھے اور باوجود معاصرت اور اختلاف مسلک کے وہ امام اسفرائنی کی بہت تعظیم کرتے اور سارے فقہائے عصر پر انکو فوقیت دیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بڑھ کر شافعیہ میں اور کوئی فقیہ نہیں دیکھا[8]

[1] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۴ [2] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۸ [3] طبقات کبریٰ ج ۳، ص ۲۶ [4] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۳ [5] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰ [6] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۵ [7] المنتظم ج ۷ ص ۲۷۷۔

ایک اور قول ..... میں انہوں نے فرمایا کہ امام ابو حامد میرے نزدیک امام شافعی سے بھی زیادہ صاحب فقہ اور صاحب نظر تھے[۱] جب شیخ ابو اسحاق شیرازی نے یہ سُنا تو فرمایا کہ یہ امام قدوری کا اپنا خیال ہے، کچھ لوگوں نے اس قول میں امام شافعی کی شخصیت سے احناف کے تعصب کی جھلک محسوس کی، اسی لیے یہ کہا گیا کہ جہاں تک امام شافعی جیسا ہونے کی بات ہے تو بقول شاعر[۲]

نزلوا بمكة في قبائل نوفل ونزلت بالبيداء ابعد منزل

امام قدوری کی نیت جو بھی رہی ہو اس سے قطع نظر بعض دوسرے حضرات شوافع نے بھی امام اسفرائنی کو "شافعی ثانی" لکھا ہے[۳] یہ بھی لکھا گیا ہے کہ امام شافعی اگر انکو دیکھتے تو خوش ہوتے[۴]

ایک دوسرے نامور حنفی فقیہ امام عبداللہ صیمری نے بھی امام اسفرائنی کی جلالت علمی کے اعتراف میں کہا تھا کہ میں نے امام ابو حامد اور امام ابو الحسن خزری داؤدی سے بڑھ کر کسی اور فقیہ کو نہیں دیکھا۔[۵] امام نووی کے شیخ عمرو ابن الصلاح نے فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی مشہور حدیث ہے:

ان الله عز وجل يبعث لهذه الامة على راس كل مائة سنة من يجدد لها دينها۔ (کتاب الملاحم، سنن ابی داؤد)

بعض علماء نے لکھا کہ چوتھی صدی میں اس حدیث کا مصداق امام ابو حامد اسفرائنی ہیں، ان سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیز، امام شافعی اور امام ابن سریج کو پہلی، دوسری

---

[۱] طبقات شیرازی ص ۱۰۳ [۲] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶ [۳] طبقات ابن شہبہ ۱ ص ۱۶۱ [۴] تاریخ بغداد و فیات بحوالہ سابقہ [۵] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰۔

اور تیسری صدیوں کا مجدد ملت قرار دیا گیا تھا۔[۱]

ابن اثیر نے جامع الاصول میں اور زیادہ صراحت کے ساتھ لکھا کہ امام ابو حامد بقول شافعیہ، چوتھی صدی کے مجدد ہیں، احناف ابوبکر محمد بن موسیٰ خوارزمی کو، مالکیہ ابو محمد عبد الوہاب بن نصر کو حنبلیہ ابو عبداللہ حسین بن علی حامد کو اور فرقہ امامیہ کے لوگ شریف مرتضیٰ موسوی کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے چوتھی صدی کے مجدد مانتے ہیں۔[۲]

بہر حال یہ طے ہے کہ ان کے تمام ہم عصر وں کو ان کی جلالت علمی، فضیلت اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی پر اتفاق تھا۔[۳] شیخ شیرازی اور ابن خلکان نے لکھا کہ جودت فقہ، حسن نظر اور لطافت علم میں ان کے تقدم و فضیلت پر مخالف و موافق سب متفق تھے۔[۴] امام سبکی جن کے تبصرے اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت خوب ہوتے ہیں، لکھتے ہیں کہ تصانیف کی شہرت، تلامذہ کی کثرت اور اقوال کی وسعت کے لحاظ سے فقہاء شافعیہ میں ابن سریج کے بعد امام ابو حامد جیسا کوئی اور نہ تھا' بہت سے ائمہ مسلک ایسے ہیں جو ان سے زیادہ جلیل القدر ہیں' مگر مذکورہ خوبیوں کے وہ ..... بیک وقت ایسے جامع نہیں جیسے امام ابن سریج اور امام ابو حامد ہیں۔[۵]

تقویٰ اور خدا ترسی ان کی وجاہت دینی و دنیوی کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے' علماء و فضلاء کے علاوہ اعیان سلطنت ان کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے' فخر الملک ابو غالب ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے مگر امام اسفرائنی کی زندگی، تقویٰ و ورع اور زہد کا نمونہ تھی، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ درس و تدریس کے لیے وقف تھا

---

[۱] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰ [۲] روضات الجنات ص ۸۴ [۳] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۶ [۴] طبقات شیرازی و وفیات بحوالہ سابقہ [۵] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۹۔

ہر آن وہ مواخذۂ نفس کا عمل پیش نظر رکھتے، کلام کی دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں وہ اس کا بڑا لحاظ رکھتے کہ کہیں کوئی نامناسب بات زبان سے سرزد نہ ہو، زبان کی لغزش پر خاص توجہ تھی، سبقت لسانی پر بھی اپنا احتساب کرتے۔

ایک بار مناظرہ کے دوران زبان سے کوئی ایسی بات نکلی جو نامناسب تھی، بعد میں اس کا احساس ہوا تو اسی دن فریق مخالف کے پاس معذرت کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور یہ شعر پڑھے:

جفاء جری جہراً لدی الناس وانبسط وعذر اتی سراً فاکد ما فرط

ومن ظن ان یمحو جلی جفاء خفی اعتذار فھو فی اعظم الغلط

دوسروں کو بھی انہی باتوں کی تلقین کرتے، چنانچہ ایک بار طاہر عبادانی سے یہ فرمایا کہ جدل و مناظرہ کی مجلسوں میں میری تمام باتوں کو زیادہ اہتمام سے نقل نہ کرو، اس لیے کہ اس قسم کی مجالس میں مقصد، فریق مخالف کو قائل و مغلوب کرنا ہوتا ہے یا پھر اس کو مغالطہ و غلط فہمی میں مبتلا کرنا ہوتا ہے، خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت کم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو تو ان چرب زبانیوں کے مقابلہ میں خاموشی و سکوت کہیں زیادہ بہتر ہے اور حق تو یہ ہے کہ اگر ہمارا زیادہ وقت ایسے شغلوں میں صرف ہوتا رہا تو ہم اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوں گے یہ اور بات ہے کہ اس کی رحمت ہماری دستگیری کرے۔

امام سبکی نے اس قول پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے کہ امام ابو حامد اسفرائنی کے مذکورہ قول سے خود ان کے اخلاص کا اظہار ہوتا ہے، وہ خدا کی رحمت کے آرزومند ہیں، یہ آرزو برحق ہے کیونکہ ان کی مجالس بحث و جدل اور مناظروں کا مقصد، علم کی

نشر و اشاعت، طلب علم کی تحریص اور اقامت حجت کی تعلیم ہے اور اہل حق کی نظر میں یہ قابل قدر ہے اور اس کی برکت اور اس کا نفع و فیض جاری ہو کر رہتا ہے، بقول امام سبکی یہ امام ابو حامد اسفرائنی کے اخلاص اور پاکیزگی نیت کا ثمرہ تھا کہ جس قدر علم ان کی شخصیت کے ذریعہ سے عام ہوا اتنا ان کے اور کسی ہم عصر یا بعد میں آنے والوں سے نہیں ہوا، انھوں نے اپنے علم سے ایک جہاں آباد کر دیا، امام سبکی کے الفاظ یہ ہیں:

کتب عنہ من العلم ما لم علم جتنا ان سے حاصل کیا گیا اسکی

یکتب نظیرہ عن احد بعدہ نظیر ان کے بعد بھی نہیں ملتی، اس

فللّٰہ ھذا الاخلاص فی کثرت نفع میں اخلاص شامل تھا،

ھذہ الکثرۃ فانہ طبق الدنیا بعلمہ اسی لیے وہ اپنے علم سے دنیا پر چھاگئے۔

امام اسفرائنی کی یہ فیاضی اور سخاوت صرف علم کی دولت ہی سے خاص نہ تھی، انکے پاس کثرت سے تحفے اور ہدیے آتے رہتے تھے اور یہ سب کے سب مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیے جاتے، بعض نادار شاگردوں کو وہ ہر ماہ ۱۶۰ دینار دیتے تھے۔

ایک موقع پر انہوں نے حج کے ایک خواہشمند کو ہزار دینار دیے۔[۱]

ذکر و شکر: ایک بار انہوں نے مشہور شاعر ابو الفرج دارمی صاحب الستذکار کی عیادت کی تو دارمی نے یہ اشعار کہے، خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ دارمی نے مجھے یہ اشعار سنائے تھے[۲]

---

[۱] طبقات کبریٰ بحوالہ سابق [۲] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۹۔

مرضت فارتحت الی عائد فعاد فی العالم فی واحد

ذاک الامام ابن ابی طاہر احمد ذوالفضل ابوحامد

جلوتوں کے علاوہ خلوت میں بھی زبان ذکر الٰہی میں مشغول رہتی، قلم ہاتھ سے رکھ دیتے تو قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگتے یا پھر تسبیح کا ورد کرتے، راستہ سے گزرتے وقت بھی تسبیح و تحمید سے زبان تر رکھتے[1]

ایک وقت وہ تھا جب تلاش معاش میں وہ گھروں کی چوکیداری کرتے تھے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے انکو نوازا تو انھوں نے مصر سے امام شافعی کی کتاب امالی سو دینار میں خرید کی[2] عیسیٰ بن طامس نے انکو موسم حج میں مکہ میں دیکھا کہ شاہانہ پوشاک ان کے زیب تن ہے اور انکی سواری بھی نہایت قیمتی ہے، وہ طواف کرتے اور لوگ تعظیم میں ان کے جلو میں رہتے، ایک ایسے ہی موقع پر قاری نے یہ آیت تلاوت کی کہ:

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا

اسے سن کر وہ بہت روئے اور فرمایا کہ اے رب ہم علو و سربلندی چاہتے ہیں، فساد نہیں چاہتے۔

اما العلو یارب فقد اردناہ واما الفساد فلم نردہ[3]

بعض مروی احادیث اوپر گزر چکا ہے کہ انھوں نے نامور محدثین سے سماعت و روایت حدیث کی ہے، اگرچہ ان کی مرویات کی تعداد بہت کم ہے مگر وہ ثقہ تھے اور

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۸ [2] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶ [3] لیکن امام سبکی نے اس واقعہ کے متعلق حج کا ذکر نہیں کیا صرف یہ لکھا ہے کہ ایک بار انکی مجلس میں یہ آیت تلاوت کی گئی تو انھوں نے مذکورہ جملہ کہا۔ طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶۔

طبقہ محدثین میں بھی درجہ امامت رکھتے تھے، امام خطیب بغدادی نے محمد بن احمد بن شعیب رویانی کے سلسلہ سے ان سے یہ حدیث بیان کی لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ[1]

امام سبکی نے بھی ان سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے، اس کے سلسلہ اسناد میں ان کے شیخ ابراہیم بن محمد بن عبدک وغیرہ ہیں جنھوں نے حضرت نعمانؓ بن بشیر سے یہ روایت کی ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الحلال بین والحرام بین وبین ذلک امور مشتبہۃ لا یعلمھا کثیر من الناس فمن اتقی الحرام کان اوفی لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبھۃ وقع فی الحرام کالراتع یرتع حول الحمی وان حمی اللہ فی الارض محارمہ و من یرتع حول الحمی یوشک ان یجسر[2]

تلامذہ و رواۃ وہ منارۂ علم تھے، ان سے روشنی حاصل کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے، بقول امام شیرازی "زمین ان کے شاگردوں سے معمور تھی"[3] طبق الارض بالاصحاب۔ ابن شہبہ نے لکھا کہ پورے عالم اسلام میں ان کے شاگرد موجود تھے لیکن بغداد کے فقہا اور ائمہ نے تو عام طور سے ان سے اکتساب فیض کیا[4]، ان کی ایک ایک مجلس میں تین سو طالبین علم تو عام طور سے شریک ہوا کرتے، کبھی کبھی یہ تعداد سات سو تک پہنچ جاتی[5] وہ عام طور سے مسجد عبداللہ بن مبارک میں درس دیتے تھے، یہ مسجد

---

[1] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۶۹ [2] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۰ [3] طبقات شیرازی ص ۱۰۳ [4] طبقات شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱ [5] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۵ العبر ج ص ۹۲۔

قطیعۃ الربیع کے قلب میں واقع تھی[1] اوپر امام سبکی کا یہ قول گزر چکا ہے کہ شاگردوں کی کثرت میں امام ابن سریج کے بعد امام ابوحامد جیسا اور کوئی نہ ہوا، انکے شاگردوں کی اس کثرت کو دیکھتے ہوئے ان کے نام شمار نہیں کیے جا سکتے، تاہم ان کے نامور شاگردوں میں سے بعض کے نام یہاں نقل کیے جاتے ہیں کہ ان شاگردوں کی جلالت علمی سے استاذ کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

فقہ کے علوم حاصل کرنے والوں میں اقضی القضاۃ امام ابوالحسن ماوردی صاحب الحاوی، قاضی ابوالطیب طبری، ابوعلی سنجی اور ایک روایت کے مطابق امام قفال مروزی اور ابوالحسن احمد محاملی اور سلیم بن ایوب رازی ہیں۔

قاضی ابوالطیب طبری برابر ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، انھوں نے بعض مسائل میں اپنے استاذ کی تعقیب بھی کی[2]

ابوالحسن محاملی ان کے خاص شاگرد تھے، شریف مرتضی موسوی کا قول ہے کہ ایک بار یہ دونوں استاد شاگرد میرے پاس آئے تو امام اسفرائنی نے فرمایا کہ یہ محاملی ہیں اور حفظ فقہ میں مجھ سے بہتر ہیں[3] لیکن جب محاملی نے اپنی مشہور کتاب المقنع لکھی تو امام اسفرائنی نے اس سے سخت اختلاف کیا، ان کا خیال تھا کہ اس کتاب میں بے اعتدالیاں ہیں اور اس کا نقطۂ نظر جمہور سے الگ ہے اور اس سے لوگوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے کیونکہ وہ مسلک شافعی اور علم اختلاف الفقہاء سے بے رغبت ہو جائیں گے، اسی لیے انھوں نے محاملی کو اپنی مجلس میں آنے سے روک دیا، چنانچہ وہ اگرچہ ان مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے تاہم کوشش کرتے تھے کہ دوسرے

---

[1] المنتظم ج ۸ ص ۲۷۷ [2] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۹ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۱۰۔

ذرائع سے مجالس کی بحثوں سے واقف ہو جائیں[1]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام اسفرائنی نے ناراض ہو کر بددعا دی کہ محاملی نے میری کتابوں کو قطع کیا ہے، خدا ان کی عمر کو قطع کرے، بتر کتبی بتر اللہ عمرہ[2] کہا جاتا ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد محاملی کا انتقال ہو گیا۔

ان کے سب سے خاص اور عزیز شاگرد سلیم بن ایوب رازی ہیں، ان کا ذکر امام سبکی نے شیخ فقیہ فاضل کے الفاظ سے کیا ہے، سلیم رازی نے امام اسفرائنی سے اپنے تعلق کا ذکر خاص انداز میں کیا ہے کہ وہ بغداد میں کسی بزرگ کی خدمت میں جا رہے تھے، راستہ میں امام اسفرائنی کی مجلس دیکھی تو سر راہ کچھ دیر کے لیے وہاں رک گئے، اس وقت کتاب الصیام کے مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی، ان کو یہ بحث اچھی لگی تو اسے قلم بند کر لیا، گھر آکر جب پھر انکو دیکھا تو انکو یہ اقوال اس قدر پسند آئے کہ انہوں نے مستقل انکی خدمت میں حاضری کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ امام اسفرائنی کے اقوال و تعلیقات کے سب سے بڑے راوی وہی ہوئے[3]

ان حضرات کے علاوہ حدیث میں ان سے سماعت و روایت کرنے والوں میں ابومحمد حسن بن محمد الخلال، ابوالقاسم عبدالعزیز بن علی الازجی، ابومنصور محمد بن احمد بن شعیب رویانی اور ابوالحسین احمد بن محمد النقور ہیں[4]

شعر و شاعری سے دلچسپی وہ شاعر تو نہیں تھے، مگر ذوق شعری سے بیگانہ بھی نہیں تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ اشعار پڑھے[5]

لا یغلون علیک الحمد فی ثمن   فلیس حمد وان اثمنت بالغال

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۱۰ [2] ایضاً [3] روضات الجنات ص ۲۸ [4] انساب ج ۱ ص ۱۴۳ [5] طبقات کبری ج ۳ ص ۲۶۔

الحمد یبقی علی الایام ما بقیت   والدھر یذھب بالاحوال والمال

ایک دوسری روایت کے مطابق قاضی ترمذ نے ان کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے تھے، اوپر گذر چکا ہے کہ ایک اور موقع پر انھوں نے یہ اشعار پڑھے تھے۔

جفاء جری جھرا لدی الناس وانبسط   وعذر اتی سرا فاکد ما فرط

ومن ظن ان یمحو جلی جفائہ   خفی اعتذار فھو فی اعظم الغلط

ایک اہم واقعہ ۳۹۸ھ میں بغداد میں شیعہ اور اہل سنت کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہوئی، وجہ یہ تھی کہ بعض شیعہ نے قرآن مجید کے ایک نئے نسخے کے متعلق کہا کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف ہے اور یہی صحیح ہے، مذکورہ نسخہ قرآن مجید کے مروجہ نسخہ سے بالکل مختلف تھا، اہل سنت اسے دیکھ کر سخت ناراض ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ میں شدت آگئی، اس موقع پر تمام علماء اور قضاۃ ایک مجلس میں جمع ہوئے، انہوں نے اس معاملہ کا جائزہ لیا اور پھر فیصلہ کے لیے امام ابو حامد کے سامنے مصحف شیعہ پیش کیا گیا، انھوں نے اسے دیکھ کر فیصلہ دیا کہ اسے جلا دیا جائے، چنانچہ تمام لوگوں کی موجودگی میں اسے نذر آتش کر دیا گیا، شیعہ یہ دیکھ کر مشتعل ہوگئے اور ان کے چند نوجوانوں نے ابو حامد کے گھر پر حملہ کر دیا، وہ اگرچہ بچ گئے لیکن کچھ عرصہ کے لیے ان کو گھر چھوڑنا پڑا، حکومت نے جب اس فتنہ کو پوری طرح فرو کیا تو پھر وہ واپس گھر تشریف لائے[1]

ایک وہم کا ازالہ علامہ شہرستانی نے کتاب الملل والنحل میں عہد اسلامی کے ان فلاسفہ کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے حکمت کی کتابوں کو یونانی سے عربی میں منتقل کیا ہے اور

---

[1] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۶

جن کی زیادہ تر رائیں ارسطالیس کی رایوں کے موافق ہیں، ان .... میں حنین بن اسحق، ابو الفرج المفسر، ابو سلیمان سنجری، یحییٰ النحوی، یعقوب کندی، محمد بن معشر مقدسی، فارابی اور ابن سینا وغیرہ کے ساتھ ابو حامد احمد بن محمد اسفزاری کا نام بھی ہے، امام سبکی کے سامنے ایک نسخہ میں بجائے اسفزاری کے اسفرائنی لکھا تھا، جس سے بہتوں کو یہ وہم ہوا کہ یہ امام ابو حامد اسفرائنی ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے امام اسفرائنی کو فلسفہ سے کوئی مس نہ تھا، چنانچہ جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسفرائنی کی جگہ اسفزاری ہی صحیح ہے، یہ امام ابو حامد کے ہم نام شہر اسفزار سے تعلق رکھتے تھے جو ہرات اور سجستان کے درمیان واقع ہے، اس وہم کے ازالہ کے محقق ہو جانے کے بعد امام سبکی کو اطمینان ہوا[1]

وفات تقریباً چالیس سال تک علم و فضل کی روشنی سے ایک عالم کو منور کرنے کے بعد یہ آفتاب علم قیامت تک کے لیے روپوش ہوگیا، ۱۷ برس کی عمر سے انہوں نے اپنے علم کا فیض عام کرنا شروع کیا اور تادم آخر یہ سلسلہ جاری رہا، پھر بھی جب وفات کا وقت قریب آیا تو یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا کہ ہم تو ابھی تفقہ بھی نہ سمجھ پائے تھے، ۱۹ شوال ۴۰۶ھ سنیچر کی شب میں آپکا انتقال ہوا، اگلے روز جبرانی الدین کے پیچھے ایک وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جنازہ میں شرکت کے لیے ایک خلقت امنڈ پڑی تھی، بے شمار لوگ تھے[2] اور شدت غم سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، بقول ابن ہدایہ تاریخ کے صفحات میں یہ دن لوگوں کی کثرت اور گریہ و بکا اور غم و الم کی شدت کی وجہ سے یاد کیا جائے گا[3] اس کے ساتھ ہی امام

---

[1] طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۷ [2] المنتظم ج ۷ ص ۲۷۸ [3] طبقات ابن ہدایہ ص ۴۲

اسفرائنی کی مقبولیت اور ان کی شخصیت کی محبوبیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم وفضل اور صفات حمیدہ کی بنا پر ہر خاص و عام کے دل میں جاگزیں تھے۔ امامت ابوعبداللہ بن مہتدی (مہدی) خطیب جامع منصور نے کی، امام خطیب بغدادی بھی اس نماز میں شریک ہوئے، تدفین ان کے گھر ہی میں ہوئی لیکن وجہ نہ معلوم ہوسکی کہ ایسا کیوں ہوا، پھر چار برس کے بعد ۴۱۰ھ میں مقبرہ باب حرب میں دوبارہ تدفین ہوئی، امام یافعی کہتے ہیں کہ چار برس کے بعد بھی ان کی میت پر کسی قسم کی بوسیدگی کے آثار نہیں تھے، بقول امام یافعی اسے ان کے حق میں کرامت کا ظہور ہی کہیں گے[1]

تصنیفات ہم امام سبکی کا یہ قول اوپر نقل کر چکے ہیں کہ تلامذہ کی کثرت، اقوال کی وسعت اور تصنیفات کی شہرت کے لحاظ سے امام ابن سریج کے بعد سرفہرست امام ابوحامد اسفرائنی ہیں، ان کی تصنیفات تعداد میں گرچہ نسبتاً کم ہیں، تاہم شہرت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے وہ نہایت اہم ہیں، امام ابن خلکان نے لکھا کہ انہوں نے مختصر المزنی پر ایک تعلیق مرتب کی تھی[2] اس کے علاوہ انھوں نے التعلیقۃ الکبریٰ اور کتاب البستان کا ذکر کیا ہے[3] صاحب العبر نے لکھا کہ ان کی تعلیق ۵۰ جلدوں میں ہے[4] اصول فقہ میں بھی انکا ایک رسالہ تھا[5]

تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے انہی کتابوں کا ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ چلپی نے التعلیقۃ الکبریٰ فی الفروع کے مکمل نام سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلک

۱؎ مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۷ ۲؎ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۳ ۳؎ العبر فی خبر من غبر ج ۳ ص ۹۲ ۴؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۔

شافعی میں یہ عظیم کتاب ہے[1] اس اجمال کی شرح امام نووی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ جمہور فقہاء خصوصاً عراق و خراسان کے فقہائے شافعیہ کی کتابوں کا دار و مدار امام اسفرائنی کی اسی تعلیق پر ہے، جو کم و بیش پچاس جلدوں پر محیط ہے، اس میں اصول و فروع، فقہاء کے مسلک، ان کے مفصل دلائل اور اعتراضوں کے جواب پر مشتمل نہایت عمدہ بحثیں جمع کر دی گئی ہیں، بے شبہ اس جیسی کوئی اور کتاب نہیں ہے، یہ بے مثل ہے[2] البتہ اس کتاب کے چند نسخوں میں بعض مسائل کی عبارتوں میں باہم اختلاف تھا جن کو امام نووی نے شرح مہذب میں یکجا کر دیا تھا[3] یہی بات امام سبکی نے بھی لکھی ہے کہ انہوں نے دمشق کے مدرسہ ناصریہ کے کتبخانہ میں اس کتاب کے اکثر حصے سلیم رازی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دیکھے تھے، جن پر امام بندنیجی کے ہاتھ کے تعلیقات بھی موجود تھے، کچھ اور بھی نسخے تھے جن میں قدرے تفاوت تھا[4] ابن شہبہ نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا کہ اس میں فقہاء کے اختلاف اور انکے اقوال، مآخذ اور مناظرے جمع کیے گئے تھے[5]

مختصر المزنی پر ان کی تعلیق کا ذکر کئی لوگوں نے کیا لیکن اس پر تبصرہ کسی نے نہیں کیا، البتہ امام ابو اسحاق شیرازی نے یہ ضرور لکھا کہ اس تعلیق پر بھی کئی اور تعلیقات لکھی گئیں[6]

یہی حال کتاب البستان کا ہے جس کا پورا نام علامہ چلپی نے بستان فی النوادر والغرائب تحریر کیا ہے[7] صرف امام یافعی نے اتنا اور لکھا کہ یہ ایک مختصر حجم کی کتاب تھی،

۱؎ کشف الظنون ج ۱ ص ۴۲۵ ۲؎ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۱۰ ۳؎ ایضاً ۴؎ طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۸
۵؎ طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۱ ۶؎ طبقات شیرازی ص ۱۰۳ ۷؎ کشف الظنون ج ۱ ص ۱۹۷۔

جس میں غرائب اقوال و مسائل تھے[1] امام سبکی نے ایک کتاب رونق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب بھی امام اسفرائنی سے منسوب ہے[2] علامہ چلپی نے مزید تصریح کرتے ہوئے لکھا کہ یہ امام محاملی کی مشہور کتاب اللباب کے طرز پر تھی، مختصر تھی اور اس میں فروع مسائل پر گفتگو تھی، لیکن یقین سے انہوں نے بھی اس کتاب کو ان سے منسوب نہیں کیا اور یہ لکھا کہ یہ ابو حاتم قزوینی کی تصنیفات میں بھی شمار ہوتی ہے اور یہ بات یوں بھی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ابو حاتم قزوینی، امام محاملی کے شاگرد تھے اور رونق کے مسائل میں امام محاملی کا رنگ صاف نمایاں ہے[3] صاحب اعلام نے البتہ مطلقاً اسے امام اسفرائنی کی تصنیفات میں شمار کیا ہے[4]

اصول فقہ میں ان کے رسالہ کا ذکر بعض جگہ ملتا ہے لیکن تفصیلات کہیں نہیں ملتیں، حتیٰ کہ کشف الظنون کے صفحات بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

مسائل و فوائد وغیرہ اس قدر اہم کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود ہم براہ راست ان کے علمی تبرکات کے استفادہ سے محروم ہیں کہ اب یہ کتاب عموماً دستیاب نہیں، ممکن ہے کسی کتبخانہ میں ان کے نسخے محفوظ ہوں، لیکن سردست وہ ہماری دسترس سے باہر ہیں، امام سبکی نے حسب عادت ان کے چند اقوال و مسائل کو نقل کیا ہے جو زکوٰۃ، طلاق، عتاق اور باب الشہادت سے متعلق ہیں، لیکن وہ نہایت مختصر اور غیر اہم ہیں، اس لیے ان کو یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہے۔

---

[1] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۱۵ [2] طبقات ابن شہبہ ج ۱ ص ۱۶۲ و طبقات کبریٰ ج ۳ ص ۲۸ [3] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۰۸ [4] اعلام ج ۱ ص ۶۵۔

بہار دانش

از جناب رام لعل نابھوی صاحب

یہ کتاب فارسی زبان میں بالکل فرضی اور تمثیلی داستانوں پر مشتمل ہے۔ شیخ عنایت اللہ کمبو لاہوری نے اسے ۱۰۶۱ ہجری میں مکمل کیا۔

یہ ایک شاہکار ہے اور سنسکرت داستان پر مبنی ہے۔ اس کی کڑیاں ابوالفضل کی "بہار دانش"، حسین واعظ کاشفی کی "انوار سہیلی"، کلیلہ و دمنہ کے توسط سے سنسکرت کے "پنج تنتر" سے ملتی ہیں۔ اس کتاب کو شاہجہاں کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جب وزیر نے سفارش کے کلمے کہے تو بادشاہ نے فرمایا:

"خط ز بہشت است و بہ آب زر نوشت است۔ حق محنتش را بہ دہند"[1]

یہ کتاب ضخیم ہے۔ نثر میں ہے۔ اس کے قلمی نسخے اور مختلف مطبعوں سے چھپے ہوئے نسخے موجود ہیں۔ اردو۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی اور کچھ اور زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ حسن علی عزت حسن خاں حسین عوض رائے حسرت اور محمد اسمٰعیل طپش نے اسے اردو میں منظوم کیا۔ دکنی نثر میں بھی لکھا گیا۔ جن نسخوں کا پتہ چل سکا ان کا ذکر ملحقہ فہرست میں کیا گیا ہے۔

---

[1] محمد حسین آزاد۔ سخندان فارس طبع لاہور ۱۹۵۵ء ص ۲۵۳ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند چوتھی جلد فارسی ادب دوم ص ۲۰۸ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

تذکروں میں اس کتاب کا ذکر عام طور سے ملتا ہے۔ نفیس مضمون اور عمدہ فارسی نثر کی حامل تمثیلی داستانوں کے اس شگفتہ مجموعہ نے صدیوں تک عوام کو مسحور کیے رکھا۔ ایسی مقبولیت کم ہی کتابوں کے حصہ میں آئی ہے۔

ظاہر ہے کہ مصنف کو سنسکرت زبان پر بھی عبور حاصل تھا ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سنسکرت زبان سے داستان کو اخذ کرتا پھر اسے فارسی میں جامہ پہناتا۔ مصنف کی کوشش زور بیان پر صرف ہوئی ہے۔ عبارت مسجع اور مقفیٰ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف نے دینی اور دنیوی علوم پڑھے۔ پھر دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور خدا سے لو لگائے رہے۔ ۱۰۸۲ ہجری میں ۶۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حکایتیں پڑھتے جایئے کہیں کوئی طوطی دور دیش کی ایک حسین شاہزادی کے حسن کو بتا رہی ہے اور ایک شاہزادہ شاہزادی کو دیکھے بغیر ہی فریفتہ ہوگیا ہے۔ ایک شخص خلع بدن اور انتقال روح کا علم جانتا ہے اور شاہزادہ کو ہرن کے بدن میں داخل کر دیتا ہے اور خود شاہزادہ کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے اور محلات میں عیش و نشاط کے مزے لوٹتا ہے۔ اصل راز کھل جاتا ہے۔ شہزادہ اپنے اصلی جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ کہانی چلتی جاتی ہے اور تب ختم ہوتی ہے جب شاہزادی اور شاہزادہ کنیزوں کو لے کر صحرا میں خلوت گزیں ہو جاتے ہیں اور جان آفریں خدا کے حوالے کرتے ہیں۔

پانچ کہانیاں ایسی ہیں جن میں عورتوں کی عیاری اور غداری بتائی جاتی ہے۔ پانچ عورتیں ہیں اور سب شوہر دار۔ شوہروں کی موجودگی میں بدکاری کرتی ہیں اور خاوندوں کو علم تک نہیں ہوتا۔ ملک زادہ اور مہر بانو کی عشقیہ داستان کے

بعد داستان بہرام و زہرہ، داستان حسن تاجر۔ داستان فرخ خاں۔ داستان عزیز سوداگر اور آخر میں خلیفہ ہندوستان کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ دیو۔ پریاں عام ملتی ہیں۔ صحرا نوردی کے واقعات ہیں۔ الف لیلہ۔ حاتم طائی اور سندباد جہازی جیسے قصے بھی ہیں۔ ان کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔ عشق مرض۔ محبت۔ رفاقت۔ عداوت سبھی کچھ ہے۔ کہانی کے لحاظ سے صرف ایک داستان دلچسپ اور سبق آموز کہی جاسکتی ہے۔ جس میں تین دوستوں۔ شہزادہ۔ سوداگر اور زرگر کا قصہ ہے۔ پھول والوں کا میلہ ہے۔ عورتیں بن سنور کر گھر سے نکلتی ہیں۔ ایک شخص کسی عورت کے تیر نظر کا گھائل ہو جاتا ہے۔ بیمار ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہی کچھ عشق۔ جوانی۔ حسن پرستی۔ کہیں کہیں صبر۔ قناعت۔ ایفائے عہد کی تلقین بھی ہے۔

انسانی فطرت میں تجسس ہے۔ یہ داستانیں اس خوبصورتی سے بیان کی گئی ہیں کہ تجسس بڑھتا رہتا ہے اور قاری کتاب ختم کرکے ہی اٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس کتاب کی مقبولیت کی یہی دلیل ہے۔ بہار دانش کا اولین قلمی نسخہ ۱۰۷۱ھ کا دستیاب ہے۔ ۱۱۴۱ھ کا قلمی نسخہ میرے پاس ہے۔

ملحقہ نقشے میں ایسے تمام نسخوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جن کا پتہ لگ سکا۔ ہو سکتا ہے کوئی نسخہ رہ گیا ہو لیکن کام کرنے والے اسکالر کو مختلف جگہوں کا پتہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ نسخے اب بازار میں نہیں ملتے۔

بہار دانش از منشی عنایت اللہ

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی یا سال کتابت	سائز صفحات	مطبوعہ نام پریس	زبان	کیفیت
	بہار دانش	۱۱۴۱ ہجری	چھوٹا سائز درج نہیں		فارسی نثر	ناچیز کے پاس ہے یہ ۲۷۵ سال پرانا قلمی نسخہ ہے۔

[1] بہ حوالہ نسخہ ہائے فارسی خطی پاکستان مرکز تحقیقات فارسی پاکستان و ہند ج ۲

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۲	بہار دانش	×	نول کشور ۱۸۷۴ء	بڑا ۳۹۴	فارسی نثر	نابھوی کے پاس ہے۔
۳	بہار دانش ترجمہ	×	نول کشور ۱۸۹۱	بڑا ۸۸	اردو منظوم	نابھوی کے پاس ہے، مرزا جان عیش کا ترجمہ ہے۔
۴	بہار دانش	قلمی	× ×	×	فارسی نثر	قلمی نسخہ سنٹرل لائبریری پٹیالہ MSS نمبر ۲۳۱۴ ہے۔
۵	بہار دانش	قلمی	×	×	فارسی نثر	" "
۶	"	"	۹۶۲ھ	×	بزبان پاکستانی	قلمی نسخہ ترجمہ ہائے متون فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۲۵۷
۷	ترجمہ منظوم	"	۱۲۱۷ ہجری	×	×	" " مرزا جان عیش
۸	"	×	نولکشور ۱۲۸۶ ہجری	×	×	ترجمہ از تنہا " صفحہ ۲۵۸
۹	"		۱۲۱۳ ہجری	×	×	ترجمہ از حسین " " "
۱۰	بہار دانش	×	×	×	×	ترجمہ ہائے متون فارسی بزبانہائے پاکستانی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۲۸۱-
۱۱						فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی بمبئی کتابخانہ موسسہ صفحہ ۱۰۱

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۱۲	بہار دانش					DESCRIPTIVE CATALOGUE OF THE PERSIAN MSS — ASIATIC SOCIETY NUMBERWORK 244
۱۳	منتخب بہار دانش					-do- BY DEEPAK ROY صفحہ ۱۹ فارسی
۱۴	بہار دانش	۱۹۰۰ ہجری				صفحہ ۹۳ نسخہ ہائے خطی کتابخانہ شعبہ تحقیق و اشاعت کشمیر۔
۱۵	"					صفحہ ۱۴۲ " "
۱۶	"					" " "
۱۷	"					" " "
۱۸	"					" " "
۱۹	"					" " "
۲۰	"					" " "
۲۱	"					" " "
۲۲	"					" " "
۲۳	"	۱۲۰۵ ہجری				نسخہ ہائے خطی فارسی کتب خانہ ندوۃ لکھنؤ صفحہ ۲۸۸ -
۲۴	فرہنگ بہار دانش					کیٹلاگ فارسی عربی قلمی نسخہ جات صولت لائبریری رامپور صفحہ ۹۴۔

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۲۵	قصہ جہاندار شاہ					بہار دانش کا دوسرا نام یہ رکھا گیا۔ صولت لائبریری صفحہ ۱۰۰
۲۶	بہار دانش	قلمی ۱۱۱۷ ہجری				فہرست مخطوطات شیرانی جلد سوم صفحہ ۳۱۵
۲۷	فرہنگ بہار دانش	۱۲۴۷ ہجری				CATLOG OF PERSIN MSS MAULANA AZAD LIBRARY HABIBGANJ COLLECTION صفحہ ۱۹
۲۸	بہار دانش	قلمی ۱۰۶۱ ہجری				نسخہ ہائے فارسی خطی پاکستان مرکز تحقیقات فارسی پاکستان و ہند جلد ششم صفحہ ۱۰۰۷
۲۹	بہار دانش	قلمی ۱۰۸۲ ہجری				DSCRIPTIVE CATALOGUE OF PERSIAN MSS ASIATIC SOCEITY WARK 241 صفحہ ۱۰۶
۳۰	بہار دانش					" " "
۳۱	"					------- DESCRIPTIVE CATALOGUE OF PERSIAN MSS. ASIATIC 1985

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۳۲	بہار دانش	قلمی ۱۱۹۴ ہجری				صفحہ ۱۴۸ مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان فارسی۔ عربی۔
۳۳	"					" " "
۳۴	"					" "
۳۵	"					" " "
۳۶	"					" " "
۳۷	ہمیشہ بہار					فارسی بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صفحہ ۱۲
۳۸	بہار دانش	قلمی ۱۰۶۱ ہجری				تذکرہ مخطوطات جلد پنجم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صفحہ ۱۵۶
۳۹	"	قلمی ۱۲۴۹ ہجری				یہ بہار دانش کا اردو منظوم ترجمہ ہے، جسے طپش دہلوی نے کیا۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی جلد چہارم صفحہ ۲۲۸
۴۰	بہار دانش	قلمی ۱۲۱۹ ہجری				فہرست مخطوطات شفیع صفحہ ۲۳۶
۴۱	"	۱۰۷۱ ہجری				صفحہ ۶۷۰ فہرست نسخہ ہائے خطی موزہ ملی پاکستان کراچی۔

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۴۲	فرہنگ بہار دانش					صفحہ ۶۷۲ فہرست نسخہ ہائے خطی موزہ ملی پاکستان، کراچی۔
۴۳	"					۶۷۳ " "
۴۴	بہار دانش	قلمی ۱۱۱۵ ہجری				صفحہ ۲۶۷ فہرست نسخہ ہائے خطی کتابخانہ راجہ محمود آباد، لکھنؤ۔
۴۵	"	قلمی ۱۱۹۹ ہجری				" " "
۴۶	"	قلمی				قلمی دکنی نثر۔ صفحہ ۵۷۴۔ اردو کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند
۴۷	گلزار دانش	۱۸۰۲ء				حیدر بخش حیدری " " "
۴۸	بہار دانش (نثر)					ولایت علی " " "
۴۹	"	۱۱۴۴ ہجری				صفحہ ۶۲ فورٹ ولیم کالج کلکشن نیشنل آرکائیوز
۵۰	انگریزی					الگزینڈر ڈو ۱۷۶۸ء لندن ۳ جلدوں میں۔ دیکھیے اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند صفحہ ۵۷۴۔
۵۱	"					از سکاٹ GIANATHAN SE - -do- ۱۷۹۹ء OTT

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۵۲	جرمن					از HORKMANN ۱۸۰۲ بیجنبرگ دیکھیے اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند صفحہ ۵۷۴۔
۵۳	بہار دانش	قلمی ۱۸۹۶ء	۳۵۳			محکمہ السنہ پنجاب کے MSS ۱۶ نمبر پر درج ہے۔
۵۴	"					JERCATHA ZEIFRZIG نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔
۵۵	"					فہرست نسخہ قلمی عربی، فارسی، اردو سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سنہ ۱۹۲۹ صفحہ ۵۱
۵۶	"					بہار دانش از عنایت اللہ۔ مطبع حیدری ۴۰۸ صفحات ڈیمائی سائز ریفرنس سکشن پنجابی یونیورسٹی لائبریری
۵۷	"					مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری۔ دیکھیے فہرست مخطوطات انگریزی انڈیا آفس لائبریری۔
۵۸	"		نولکشور پریس ۱۸۱۹ء	۴۳۹ بڑا سائز	اردو نثر	نابھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس سال	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۵۹	بہار دانش		مطبع دار السلام ۱۲۶۴ہجری	۷/۴ بڑا	اردو نثر	نابھوی کے پاس ہے۔
۶۰	"		مطبع علوی ۱۲۶۴ہجری	۳۱۲ بڑا	"	" "
۶۱	گلشن دانش ترجمہ بہار دانش		بیکار خانہ شیخ نثار علی طبع	۱۸۵ بڑا	"	" "
۶۲	بہار دانش اردو				"	" " ناکمل
۶۳	بہار دانش		مطبع مصطفائی ۱۲۸۷ہجری	۲۸۸	فارسی	"
۶۴	"					عوض رائے حسرت نے اسکا ترجمہ کیا۔ منظوم ہے۔ دیکھئے نوابی عہد میں ہندوؤں کا فارسی یوگ دان صفحہ ۱۸۶
۶۵	"	قلمی نسخہ ۱۵ فارسی		۲۳۸ بڑا		پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ۔ صفحات ۲۳۸ نسخہ نمبر ۶۵۵۔
۶۶	"		مطبع ہند پریس	۲۷۰		نابھوی کے پاس ہے۔
۶۷	"	قلمی			فارسی	پنجاب یونیورسٹی ریفرنس سکشن قلمی نسخہ بہ نمبر ۶۹۵۔
۶۸	"					پنجابی یونیورسٹی۔ لائبریری۔ پٹیالہ۔
۶۹	"		مطبع انوار محمدی	۳۸۸ بڑا		" "
۷۰	"		مطبع دار السلام ۱۲۶۴ہجری	۷/۴ بڑا	فارسی	" "

نمبر شمار	نام کتاب	قلمی سال کتابت	مطبوعہ نام پریس	سائز صفحات	زبان	کیفیت
۷۱	بہار دانش		مطبع علوی	۳۶۴		پنجابی یونیورسٹی لائبریری، پٹیالہ
۷۲	"					سنٹرل لائبریری۔ پٹیالہ۔
۷۳	"	قلمی				مرآۃ العلوم جلد اول فہرست نسخ خطی اورینٹل پبلک لائبریری۔ بانکی پور
۷۴	"	"				بہ نمبر ۷۳۱۔ عنایت اللہ سیریل نمبر ۲۴۷ ایضاً
۷۵	"					بہ نمبر ۳۲، عنایت اللہ سیریل نمبر ۲۵، فہرست مطبوعات جلد دوم سبحان اللہ اورینٹل لائبریری علی گڑھ ۱۹۳۱ء۔ مولوی عنایت اللہ بہ نمبر ۲ قصص و حکایات

مقالات شبلی جلد دوم

یہ جلد مولانا شبلیؒ کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، اس کے ایک مضمون "بھاشا زبان اور مسلمان" میں دکھایا گیا ہے کہ سنسکرت اور بھاشا زبان میں مسلمانوں نے کیا کیا تصنیفات کیں اور بھاشا کی شاعری میں کس درجے کا کمال پیدا کیا ہے۔ اس میں "تحفۃ الہند" کے نام سے بھی مولانا کا ایک مضمون شامل ہے۔ "تحفۃ الہند" میں ہندوؤں کا موضوع فن بلاغت عروض و قافیہ وغیرہ ہے۔ ان مضامین سے مسلمانوں کی بے تعصبی اور علمی فیاضی کا اندازہ ہوگا۔

قیمت ۱۵ روپے

غالب کا مذاق اجتہاد

از ڈاکٹر محمد حسین فطرت، بھٹکلی۔

غالب کی شاعری گلبانگ معانی اور گنجینۂ حقایق ہے ؎

گنجینۂ معانی کا طلسم اسکو سمجھئے ‌ ‌ جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

غالب نے اپنے ایک مصرعے میں اپنی شاعری کا پورا تعارف کرایا ہے ع

سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری

غالب کی شاعری سادگی و پُرکاری اور بیخودی و ہشیاری کی متضاد و متخالف کیفیتوں کی آئینہ دار ہے اور یہی غالب کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں۔ غالب کی پہلودار شخصیت بڑی رنگارنگی اور تنوع کی حامل تھی۔ انکی نگاہِ حقایق آشنا نے کیسے کیسے اسرار و معارف سے نقاب کشائی کی، انھوں نے غم و انبساط کے گوناگوں معانی و مفاہیم کا سراغ لگایا۔ خواب و بیداری اور موت و حیات کی متعدد فلسفیانہ تاویلات بیان کی ہیں اور مختلف زاویہ ہائے نظر سے نور و ظلمت۔ خار و گل اور دشت و صحرا کی تعبیریں پیش کی ہیں، وہ انسانی نفسیات کے نباض اور رمز شناس تھے۔ ان کی شاعری میں کہیں شعلے کی حرارت ہے اور کہیں شبنم کی برودت و لطافت، جلال و جمال کے دلنشیں امتزاج نے غالب کی شاعری کو رنگ دلبا اور حسن دلربائی کا مرقع بنا دیا ہے۔ غالب کے نزدیک شاعری اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے غالب کی شاعری کو ہر قاری اپنے ہی دل کی دھڑکن تصور کرتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ‌ ‌ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مگر غالب نے جب معانی و مفاہیم کے نئے افق کا پتہ لگایا اور اپنے افکار کو جدت و تنوع کی کہکشاں سے مزین و آراستہ کیا تو انکی بلندی فکر کے نقوش ان کے زمانہ کے مروجہ فکری پیمانے سے متصادم ہو گئے۔ اس لیے انکی شاعری اپنے اور بیگانے کے لیے معمہ بن گئی اور رموز غالب کی عقدہ کشائی سے لوگ قاصر رہے۔ آخر کار غالب احباب کی ناقدریوں کے شکار ہو گئے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا ‌ ‌ گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے ‌ ‌ مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات ‌ ‌ دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور

غالب کے اجتہادی ذہن کو لکیر کا فقیر بننا قطعی گوارا نہ تھا۔ انکی پرواز تخیل نے شاعری کے ہر موڑ پر فکر و استدلال اور بصیرت و فراست کے رنگ برنگ پھول کھلائے ہیں اور مروجہ شاعری کے مطابق محبوب کے جور و ستم کا رونا رونے کے بجائے ستم یار سے لطف اندوزی کا ثبوت پیش کیا ؎

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ‌ ‌ ہم کو حریص لذت آزار دیکھکر

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو ‌ ‌ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے ‌ ‌ بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

غالب کی روایت شکنی تیشۂ فرہاد کی کوہ کنی کے مترادف ہے۔ کیونکہ انکو خامۂ معجز نما

کی جنبش سے حقائق و معارف کے کوہِ گراں سے جوئے شیر لانے کا فن بخوبی آتا ہے۔

جدتِ فکر اور ندرتِ خیال کی چمن آرائی ملاحظہ ہو ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

روایتی مضامین کا اعادہ غالب کے مجتہدانہ ذہن کے شایانِ شان نہ تھا۔ ان کی پوری شاعری مروجہ روایتی شاعری کے خلاف ایک صدائے احتجاج کے مترادف ہے۔ غالب کی جدت پسندی اور روایت شکنی کی یہ بھی ایک دلیل ہے کہ سر سید احمد خاں نے جب اپنی تازہ تصنیف دربارِ اکبری کی تقریظ کے لیے غالب سے گزارش کی تو غالب نے جدید تہذیب کا قصیدہ لکھ بھیجا۔ غالب کی جدت طرازی کی نامقبولیت کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ناسخ اور شاہ نصیر کا اسلوبِ بیان اس عہد میں مقبول و معروف تھا۔ ذوق جو ناسخ و نصیر کے مقلد تھے غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی سے سرفراز ہوئے اور غالب کے فکر و فن کا بول بالا نہ ہو سکا۔ مگر غالب خود اپنی پیشین گوئی کے

مطابق مستقبل کے عظیم فنکار تسلیم کیے گئے۔ غالب نے کہا تھا ؎

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

سچ پوچھیے تو غالب کی شاعری فردوسِ تخیل ہے۔ ان کی شاعری کے نگارستان میں گویا فردوسِ معانی کا دریچہ کھلا ہوا ہے ؎

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

اس شعر کی تشریح میں پروفیسر احتشام حسین کے یہ الفاظ پیش کرنا بہتر ہوگا۔

"حسن خود نیکی ہے۔ برکت ہے۔ حق ہے۔ سچائی میں حسن ہے اور عمل صالح حسن کا بدل یا حسن عمل ہے۔ سچائی نیکی اور خوبصورتی کے اس مثلث میں زندگی کا ہر وہ پہلو پوشیدہ ہے جس کا حصول موجبِ تسکینِ ابدی ہے" کیٹس نے جب حسن کو سچائی اور سچائی کو حسن کہا تھا تو وہ احساس کی نہیں فکر کی اسی منزل میں تھا۔

اسی طرح غالب نے فکر و خیال کو بے پناہ وسعت بخشی، بلندیٔ افکار میں غالب کا کوئی حریف نہ تھا۔ میر تقی میر کے یہاں بھی تخیل کی اتنی بلندی نہیں ہے جو اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ غالب کے فکر و فن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بے جان و بے حقیقت چیز کو ذی حقیقت اور معنی خیز بنا دیا۔ مثلاً سایہ کے متعلق کہتے ہیں ؎

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد — پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

غالب کے یہاں لفظ سایہ صرف سایہ کا اور تاریکی کا غماز نہیں ہے بلکہ سایہ ان کے نزدیک ایک وجود تھا کے پرزاد کی طرح ہے جس کی نقل و حرکت میں تگ و تازِ حیات پائی جاتی ہے ؎

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

شوق، خواہش، آرزو، تمنا اور حسرت جیسے الفاظ غالب کے اشعار میں جابجا پائے جاتے ہیں جو غالب کے سطحِ نظر کو سمجھنے میں ممد و معاون ہیں ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

غالب کے فکر و فن کی جدت طرازی بعد کے دور میں بہت مقبول ہوئی اور اردو شاعری کے بہت سے قافلے انکے نقشِ قدم پر جادہ پیما ہو گئے۔ مثال کے طور پر وحشت کلکتوی اور عزیز لکھنوی کو غالب کے پیچیدہ اور متنوع اندازِ فکر و فن کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ غالب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ وحشت کلکتوی کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ امتیازِ حسن ہے معنی و لفظ کا
وحشت کو جس نے غالبِ دوراں بنا دیا

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

مری ہستی کی کیا ہستی مگر اے دیدۂ بینش
ذرا نیرنگیاں تو دیکھنا اس نقشِ باطل کی

نغمۂ مطرب ہے عشق خانہ ویراں ساز کو
وہ نوائے درد جو مضمر شکستِ دل میں ہے

بیگانگی عیاں ہے گو آشنا ہے عالم
بزمِ جہاں میں گویا حرفِ شنیدہ ہوں میں

مولانا محمد حسین آزاد نے عزیز لکھنوی کے کلام پر تبصرہ اور غالب سے انکی اثر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"آج کل مرزا غالب کی تقلید عام طور پر پسند کی جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا غالب کے خصائص صرف فارسی الفاظ و تراکیب کے کثرتِ استعمال اور بشدت توالی اضافات اور لفظی اشکال اور غرائب میں محدود ہیں۔ اس گمراہی نے بہت لوگوں کو اس درجہ سے بھی محروم کر دیا۔ جو بصورتِ عدم تقلید غالب وہ حاصل کر سکتے تھے۔ مرزا غالب کی اصلی خصوصیت ان کے محاسنِ معنوی ہیں۔ نہ کہ مجرد لفظی۔ فارسی الفاظ و معانی بالقصد نہیں ہیں۔ بلکہ بوجہ وسعت و بلندیِ فکر و عدم مساعدت تراکیب اردو۔ پس تقلید اس کی ہونی چاہیئے۔ نہ کہ الفاظ کی۔ آپ (عزیز لکھنوی) اس گروہ سے بالکل الگ ہیں اور آپ کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں غلو اور افراط سے ہر جگہ اجتناب کرتے ہیں"

مولانا آزاد کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے۔ عزیزان شعرائے مختلف ہیں جنھوں نے غالب کے اسلوبِ شعری کی کورانہ تقلید کو اپنا وظیفۂ حیات بنایا۔ انکے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رگ رگ میں ذوقِ بادیہ گردی تھا اسقدر
ہر ذرہ میری خاک کا صحرائے گرد تھا

ہے تمنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا
رنگ اڑتا کہہ رہا ہے پیکرِ تصویر کا

شوریدگی کے ذوق سے فارغ نہیں ہنوز
چھینٹیں لہو کی ہیں مرے سر میں بھری ہوئی

مذکورہ بالا حقایق کی روشنی میں غالب کو اردو شاعری کا مجتہد قرار دینا بیجا نہیں ہے کلام غالب کی معنویت کے آفاق ابھی سربستہ و پنہاں ہیں جن کو آنے والا دور نمایاں کریگا۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

معارف کی ڈاک

مکتوب پیرس

پیرس، فرانس

۲۹ ستمبر ۱۹۹۴ء

مخدوم و محترم زاد مجدکم و عم فیضکم!

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ ابھی ابھی معارف کا تازہ شمارہ بابت ماہ مئی ۱۹۹۴ء ملا۔ ممنون بھی ہوا اور سرفراز بھی۔ اگر کسی اور سے کام بنتا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔ آپ نے ایک نئے (ہندی) ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا آں محترم اطلاع دے سکتے ہیں کہ سورۃ المنافقون $\frac{63}{4}$ کی آیت کانھم خشب مسندۃ کا اس میں کیا ترجمہ ہوا ہے؟[1] ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ کے ترجمے دل کو نہیں لگتے۔ دیوار پر جھکائے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کو منافقین سے کیا مشابہت ہے؟ مجھے پسند وہ ترجمہ ہے جو علامہ الغرکسی نے "مسندۃ" کے مادے میں دیا کہ وہ مالدار لوگوں کا شاندار لباس سے ذکر استناد جھکانا۔

حفظکم اللہ و عافاکم

خادم: الفقیر الی اللہ: ح

---

[1] ترجمہ کا جو حصہ خدا بخش لائبریری سے شایع ہوا ہے اس میں سورۂ منافقون کا ترجمہ درج نہیں ہے۔ (معارف)

مکتوب لاہور

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ء

مکرمی و معظمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ آپ کے دو خطوط یکے بعد دیگرے ملے تھے۔

آپ نے ماہ اگست کے شذرات میں بھارت کے مسلم معاشرے کی جن خرابیوں کی نشاندہی کی ہے، وہی خرابیاں کم و بیش ہمارے ہاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ملک سے باہر ملازمت کے حصول کی جان توڑ دوڑ لگی ہوئی ہے۔ لوگ مکانات گروی رکھ کر یا فروخت کر کے اجازت نامے (ویزے) حاصل کر رہے ہیں۔ والدین فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا خیر سے سعودی عرب یا لیبیا میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس سے ملک میں نو دولتیوں (مترفین) کا ایک طبقہ ظہور میں آ گیا ہے جو خود نمائی اور اسراف میں حد سے بڑھ گیا ہے اور کسی حد تک مہنگائی کا بھی ذمہ دار ہے۔

پڑھے لکھے نوجوان امریکہ میں اعلیٰ تعلیم یا ملازمت کی خاطر گرین کارڈ کے حصول کے لیے سرگرداں رہتے ہیں اور یہ سرگردانی جنون بنتی جا رہی ہے۔

ہمارے ہاں کے "بڑے علماء" کا معیار زندگی کسی رئیس یا امیر کبیر سے کم نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات اپنے بزرگوں کے کمالات بیان کر کے شکم پروری کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ اگر ایک جماعت صرف نماز کی دعوت دیتی ہے تو دوسرا گروہ صرف صلوٰۃ و سلام کے فضائل و مناقب بیان کرتا رہتا ہے۔ خدمت خلق اور حقوق العباد کی پاسداری کی کوئی بھی تلقین نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے سے محبت، ہمدردی،

خیر خواہی اور غمخواری کے جذبات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک گھر میں میت پڑی ہوئی ہے تو ہمسائے میں ٹیلی ویژن پر فلمی گانے لگے ہوئے ہیں۔ لاہور کی جدید اور فیشن ایبل بستیوں کا یہ حال ہے کہ اڑوس پڑوس میں رہنے والے ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا رہتے ہیں۔

قوم کی اکثریت خود غرض، خود پسند اور خودگزیں ہوتی جارہی ہے۔ ایک آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے مال و دولت کے تناسب سے لگایا جاتا ہے اور اس کی تعظیم و تکریم اس کی سیاسی اہمیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ بس پیسہ ہی پیسہ ہمارا دین و ایمان بنتا جارہا ہے۔ آرام طلبی، تساہل پسندی، کام چوری اور ڈیوٹی (فرض) سے گریز اور پہلوتہی جیسے مفاسد وبائی امراض کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا رحم نازل فرمائے اور ہمیں ہر بلا اور فتنہ سے محفوظ رکھے۔

فقط والسلام : نیازمند

(شیخ) نذیر حسین

مکتوب بریلی

۷۳۔ پھول والان، بریلی

۳ ستمبر ۹۴ء

میرے محترم! السلام علیکم

میں نے آپ کا مضمون "مولانا ابوالجلال ندوی کی یاد میں" (معارف اگست ۱۹۹۴ء) بہت شوق سے پڑھا۔ میں مولانا کا پرانا معترف ہوں۔ مولانا کے جو مضامین ماہ نو کراچی میں شایع ہوئے تھے، انکی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ نقوش صحرا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء۔ سمات ابل کے حوالے سے قرآن کے مقطعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ حقیقی جمہوریت ایک نعمت عظمیٰ۔ دسمبر ۱۹۵۹ء۔ بنیادی جمہوریت کا جائزہ قرآنی تعلیم کی روشنی میں لیا گیا ہے۔

۳۔ بلوچی ظروف پر نقوش۔ جون ۱۹۶۰ء۔ ان نقوش کا جنوبی عرب کے قدیم رسم خط یعنی سند کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

۴۔ نقش سلیمانی، قدیم سندھی رسم خط کی روشنی میں۔ دسمبر ۱۹۶۱ء۔ نقش سلیمانی کے سات نقوش پر بحث کر کے ان کے معنی بتائے گئے ہیں اور نقش سلیمانی کے اسم الٰہی اور ایک مقدس حرز ماننے سے انکار کیا گیا ہے۔

مولانا کے اور بھی مضامین ماہ نو کراچی میں شایع ہوئے ہوں گے۔ لیکن میرے پاس مذکورہ بالا مضامین ہی ہیں۔

آپ نے اپنے مضمون کے آخری پیراگراف میں جو لکھا وہ درست اور ضروری ہے۔ میری رائے میں آپ ہی سعی فرمائیں۔ مولانا کے مضامین کی اشاعت سے علمی دنیا کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

احقر العباد

لطیف حسین ادیب

معارف: ماہ نو میں مولانا ابوالجلال صاحب کے مندرجہ ذیل مضامین بھی شایع ہوئے ہیں۔

۱۔ سندھی مہریں، اگست ۱۹۵۶ء تا دسمبر ۱۹۵۶ء (پانچ اقساط)

۲۔ پیکران بے سخن، مارچ ۱۹۵۸ء۔

۳۔ سندنام کی بستیاں، مارچ ۱۹۵۹ء۔

۴۔ سندھی ظروف پر نقوش، مارچ ۱۹۶۱ء

اس کے علاوہ سہ ماہی "تاریخ وسیاسیات" (کراچی) نومبر ۱۹۵۳ء میں "موہن جوڈرو کی زبانیں" شایع ہوا تھا۔

مکتوب اسلام آباد

اسلام آباد

۲۰ر ستمبر ۹۴ء

محترم مولانا ضیاءالدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

میں مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم کا بھتیجا ہوں اور مولوی ابوالحسنات صدیقی کا سب سے چھوٹا بیٹا۔ آج کل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں افسر تعلقات عامہ ہوں۔ اس ادارے کے سربراہ جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر پروفیسر خورشید احمد سینیٹر ہیں۔ معارف اس ادارے کی لائبریری میں آتا ہے۔

اگست ۹۴ء کے شمارے میں مولانا ابوالجلال ندوی کے بارے میں آپ کا مضمون پڑھا۔ خود ہمارے علم میں بھی بے حد اضافہ ہوا۔ لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ مولوی ابوالحسنات صدیقی میرے والد، مولانا ابوالجلال ندوی کے چھوٹے بھائی تھے، بڑے بھائی نہیں تھے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کی تعلیم مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں ہوئی تھی۔ ان کا انتقال مولانا ابوالجلال کے انتقال سے کافی پہلے ۱۷ر دسمبر ۷۱ء کو ہوا تھا۔ وہ سقوط مشرقی پاکستان کا صدمہ نہ سہہ سکے تھے۔ محمود اعظم فاروقی مولانا کے حقیقی بھانجے نہیں تھے۔ مولانا کے بھانجے حکیم یامین صدیقی اور ان کے کئی بھائی ہیں۔ حکیم یامین صدیقی اور محمود اعظم فاروقی

دونوں اعظم گڑھ کے گاؤں علی پور سرسینہ کے رہنے والے تھے۔ اس بنا پر محمود اعظم فاروقی ان کو ماموں کہا کرتے تھے۔

جنید صغیر صدیقی آج کل انگلستان سے پی ایچ ڈی کرکے جامعہ کراچی میں شعبۂ شماریات کے استاد ہیں۔

جس ہفت روزے کا آپ نے "جہان" کے نام سے ذکر کیا ہے وہ ادارہ جنگ کا مشہور ہفت روزہ "اخبار جہاں" ہے۔ اس ہفت روزے کے لیے انٹرویو کا اہتمام میں نے کروایا تھا۔ جو اخبار جہاں کے اُس وقت کے ایڈیٹر نثار احمد زبیری نے کیا تھا۔ جو آج کل اسلامی یونیورسٹی ملائیشیا میں صحافت کے استاد ہیں اور انٹرویو جناب رضی الدین نے لیا تھا جو آج کل ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ اس انٹرویو کو لکھنؤ کے ایک رسالے تعمیر حیات نے شایع کیا تھا۔

پنڈت جواہر لال مولانا ابوالجلال کو مولانا اُول جلول کہتے تھے۔ ابوالجلول نہیں کہتے تھے۔ جیسا کہ اس مضمون میں آپ نے لکھا ہے، اکلوتے صاحبزادے والی بات بالکل درست ہے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ وہ پاکستان کی تحریک کے مخالف تھے جب یہاں (پاکستان میں) لوگوں نے کہا کہ آپ یہاں کی سیاست میں حصہ لیں تو انھوں نے جواب دیا کہ جب ہم نے اس کی مخالفت کی تھی تو یہاں کی سیاست میں حصہ لینا کہاں کی دیانت داری ہے۔ انھوں نے کبھی خود نمائی سے کام نہیں لیا بلکہ حد درجہ بے اعتنائی سے کام لیا، اس کا احساس مجھے ان کے انٹرویو کے اہتمام میں ہوا تھا۔

البتہ وہ کانگریس کے کبھی ممبر نہیں رہے۔ جبکہ میرے والد مسلم لیگ کے شدید حامی تھے لیکن وہ مولانا کے پاکستان آنے کے بعد پاکستان آئے۔ یہ مقالہ میرے لیے ایک ایسی علمی دستاویز ہے جس پر میں اور میرے عم زاد بھائی جنید صغیر صاحب بلاشبہ فخر کر سکتے ہیں۔ آپ سے میری ملاقات بھی ہو چکی ہے جب میں ہندوستان آیا تھا تو میرے بڑے بھائی اور میں آپ سے مولانا عبدالباری سے اور مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ملے تھے۔ میں نے تب وہاں کتبخانے میں نصب ایک فریم مولانا ابوالجلال کے نام کا بھی دیکھا تھا۔ اس پر کیا تحریر ہے اگر اس کے بارے میں کچھ پتہ چل جائے تو بہتر ہو۔ مولانا کی جو تحریریں آپ کے یہاں موجود ہیں کم از کم ان پر مشتمل کوئی کتاب شایع کر سکتے ہوں تو کر دیجئے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ مولانا کی کوئی کتاب تو شایع ہو۔ لیکن مالی وسائل اجازت نہیں دیتے اور علم سے محبت کی کمی نے اس کام کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ بہرحال میں نے ایک اکیڈمی مولانا ابوالجلال ندوی اکیڈمی کے نام سے بنائی ہے۔ اسکے ارکان میں فی الحال تو میرے بڑے بھائی احمد حاطب صدیقی، جنید صغیر صدیقی، یحییٰ بن زکریا صدیقی (مولانا کے نواسے) اور میں وجیہ احمد صدیقی شامل ہیں لیکن یہ اکیڈمی فی الحال فعال نہیں ہے۔ اگر آپ کچھ رہنمائی فرمائیں تو ہم اپنی ترجیحات کا تعین کر لیں گے اور مولانا کا کون سا کام پہلے منظر عام پر آنا چاہیے اس سلسلے میں فیصلہ کر لیں گے۔

آپ کے خط کا منتظر

والسلام: وجیہ احمد صدیقی۔

وفیات

مولانا سید اخلاق حسین دہلوی

افسوس گذشتہ ماہ مولانا سید اخلاق حسین دہلوی کی رحلت سے علم و ادب اور دلی کی تہذیب و شرافت کا ایک روشن نقش بھی مٹ گیا۔

وہ ۱۹۰۶ء میں دہلی کے ایک معزز سادات عالیات کے خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے پردادا سید علی بغدادی محمد شاہ کے زمانہ میں بغداد سے دہلی تشریف لائے، ان کے پوتے اور مرحوم کے والد ماجد محمد ابراہیم حسین کا شمار دلی کے نامور شرفاء میں ہوتا تھا، سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ ان کے رشتہ کے چچا تھے اور مولانا دہلوی کے بھائی حکیم سید حسین دہلوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دلی کی تہذیب و معاشرت کے شاید آخری کامل نمونہ تھے۔ ان کا انتقال کچھ عرصہ قبل ہوا۔ پہلے عرب سرائے دلی کے شرفاء کی قابل احترام بستی تھی، گردش روزگار سے جب یہ اپنے مکینوں سے خالی ہوئی تو اس کے آثار و باقیات کو سخت حالات کے باوجود ان دونوں بھائیوں نے قائم رکھنے کی سعی کی اور اس کے قبرستان و مساجد کی تولیت ان ہی کے ہاتھوں میں رہی۔

خاندان کے علمی ماحول کے اثر سے سولہ برس کی عمر ہی میں مولانا اخلاق دہلوی کے قلم سے ایک کتاب نکلی۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے میرٹھ کے قصبہ بڑوت کے ایک کالج میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے، اسی زمانے میں انھوں نے درسیات کا

سلسلہ شروع کیا جیسے مضمون نگاری، میزان سخن، خلاصہ مصباح القواعد اور شمیم بلاغت وغیرہ۔ اردو کالج دہلی کے طالب علموں کی سہولت کے لیے مولانا امام بخش صہبائی کی کتاب حدائق البلاغت کی تلخیص روح بلاغت کے نام سے کی، یہ سب کتابیں مقبول ہوئیں اور طلبہ کے علاوہ عام اردو خواں طبقہ کو بھی اس سے فائدہ پہنچا، مولانا کی علمی و تحقیقی کاوشوں کا موضوع خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سوانح اور مشائخ چشت کے ملفوظات ہیں، حضرت امیر خورد سید محمد کرمانی کی سیر الاولیاء میں الحاق و تحریف کا احساس اہل نظر کو تھا لیکن حقائق سے روشناس کرانے کی سعادت علامہ مرحوم کے حصہ میں آئی اور اہل علم نے اسے نگاہِ تحسین سے دیکھا، بعد میں انہوں نے حیات طیبہ حضرت محبوب الٰہی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو مستند ہونے کے علاوہ مولف کے جذبۂ خلوص اور شائستہ و شستہ انداز تحریر کا نمونہ ہے، اس میں ایک جگہ انہوں نے سیر الاولیاء کے متعلق لکھا کہ "اسلوب بیان سبحان اللہ، کیسا سادہ و پُرکار ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی، طرز ادا شائستہ اور بیان سلجھا ہوا ہے، روانی اور بے ساختگی سے مالا مال، مطالب کا یہ عالم ہے کہ مونہہ سے بولتے بول رہے ہیں، جملے موتیاں کی لڑیاں اور لفظ ڈھلکتے ہوئے موتی ہیں، معرفت کی رنگ آمیزی سے اسلوب کا رنگ چوچہا اٹھا ہے"۔ حق یہ ہے کہ یہی تعریف ان کی کتاب پر بھی صادق آتی ہے، پوری کتاب ایسے ہی حسین اور دلکش جملوں سے آراستہ ہے، مثلاً ایک جگہ امیر التبلیغ مولانا محمد یوسف کے متعلق لکھا کہ "نفوذ و بیہی کا یہ عالم ہے کہ کروڑ کروڑ مجاہدہ چار ملاقات میں گرویدہ ہو جاتا ہے"۔ ایک جگہ سجادہ نشینی و آستانہ نشینی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ "خلاصہ کلام یہ ہے کہ سجادہ نشینی اور آستانہ نشینی میں

زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ وہی فرق ہے جو نانی اور جانی میں ہے، سجادہ نشین فرزند جانی ہوتا ہے، دونوں میں امتیاز نہ کرنا کھلا جہل ہے"۔ اس کتاب کے حواشی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو دلی کے قدیم خانوادوں کی تاریخ پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "آئینہ ملفوظات" ہے، خواجگان چشت کے ملفوظات کے متعلق جب ایک حلقہ میں یہ بحث شروع ہوئی کہ وہ جعلی و الحاقی ہیں تو وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور پھر معارف ۱۹۷۰ء کی کئی قسطوں میں انہوں نے مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات کے نام سے ایک بلند پایہ تحریر سپرد قلم کی، بعد میں یہ کتابی شکل میں بھی شایع ہوئی ان کے علم و مطالعہ، حسن استدلال اور زبان و بیان کی صفائی کا یہ بہترین نمونہ ہے، خود ان کو بھی اس کا احساس تھا کہ "اگرچہ معاندین کے تحقیر آمیز اشتعال پیدا کر سکتے تھے لیکن میں نے دلی کی قدیم تہذیبی روایات کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑا نہیں اور ترکی بہ ترکی جواب نہیں دیا، یہی آئین تصوف کا اقتضا بھی ہے"۔

آخر عمر میں انہوں نے 'ویدک دھرم اور اسلام' کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی، اس میں انہوں نے ویدک دھرم کے آسمانی مذہب ہونے اور ویدوں اور رشی منیوں کی تاریخی و مذہبی حیثیت پر دلچسپ بحث کی، معارف میں تبصرہ کے لیے یہ کتاب آئی لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں اس پر تبصرہ نہیں آسکا۔

معارف اور دار المصنفین کے وہ قدر داں تھے اور محبت کا تعلق رکھتے تھے، ایک بار ایک خط میں بڑی اپنائیت سے لکھا کہ "معارف کی کتابت و طباعت

کا وہ معیار نہیں رہا جو تھا، کاتب صاحب احتیاط سے کام لیں، قلم جما کر لکھیں اور اشکال صحیح بنائیں، نوک پلک کا بھی خیال رکھیں، شین مین صاحب روشنائی میں وارنش کی آمیزش گوارا کریں تو معیار پر آجائے گا، بقول مہدی افادی پیکر جمیل بہ لباس حریر ہی دل کو بھاتا اور لبھاتا ہے"۔

اب دلی کی ٹکسالی منجھی اور صاف زبان لکھنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، مولانا مرحوم ان کی آخری یادگار تھے۔ ان کو دیکھنے والے ان کی تہذیب و شرافت، زندہ دلی اور مجسم اخلاق ہونے کے گواہ ہیں۔

۱۹۴۷ء کی غارت گری کے زمانہ میں ان کا کل اثاث البیت لٹ گیا، گھر پر غیر قابض ہو گئے، لیکن جس سرمایہ کے لٹنے کا غم ان کو آخر تک رہا وہ انکے بزرگوں کا اندوختہ اور صدیوں کے بیش بہا نوادر کا ذخیرہ اور ان کی زندگی کا آسرا ان کا کتب خانہ تھا، یہ ایسا برباد ہوا کہ پھر ایک پرزہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنے فضل و کرم کی ردائے خاص کا سایہ کرے، آمین۔

ع۔ ص۔

مطبوعات جدیدہ

مونس الارواح تالیف شہزادی جہاں آرا بیگم، تصحیح و مقدمہ از جناب قمر جہاں بیگم، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور نہایت عمدہ کتابت و طباعت، مجلد صفحات حصہ فارسی ۱۳۳ اور حصہ انگریزی ۱۰۲، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: ۲-۱۱ی، ۷/۱۷، ناظم آباد کراچی ۱۸، پاکستان۔

مونس الارواح، جہاں آرا بیگم کی مشہور و مقبول کتاب ہے۔ جس کا موضوع خواجہ معین الدینؒ اجمیری چشتی اور ان کے سلسلہ سلوک کے مزید پانچ مشائخ کے حالات و سوانح ہیں اس کتاب سے جہاں مشائخ چشت سے شہزادی جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اس کی علمی لیاقت اور تصنیفی صلاحیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس کتاب کے صرف چار قلمی نسخے موجود ہیں جن میں ایک نہایت خوبصورت و بیش قیمت نسخہ کتب خانہ دار المصنفین کی زینت ہے، اب پاکستان سے قمر جہاں صاحبہ نے اس کا متن تصحیح و تحشیہ کے بعد اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے، انھوں نے فارسی کے علاوہ انگریزی زبان میں شہزادی کے مفصل حالات بھی تحریر کیے ہیں، مونس الارواح میں جابجا اشعار کے موتی بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ خود جہاں آرا کے ہیں، لیکن مقدمہ نگار نے ایک رباعی کے متعلق یقین سے لکھا کہ یہ مولانا جامی کی ہے، دوسرے اشعار بھی ان کے خیال میں اوروں کے ہوں گے، بہتر ہوتا کہ ان کی باقاعدہ تخریج کر کے اصل شاعروں کے ناموں کی تعیین

کردی جاتی۔ اس کتاب کی کتابت وطباعت اور جلد وغیرہ مونس الارواح کے شایان شان ہے۔

مولانا آزاد کا قیام رانچی احوال وآثار مرتبہ جناب جمشید قمر، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۱۵، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

بہار کے شہر رانچی کو مولانا ابوالکلام آزاد سے خاص نسبت ہے، اپنی پہلی نظربندی و جلاوطنی کے عالم میں انہوں نے اسی زمین پر وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح عقائد اور تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے کر سنت یوسفی کا احیاء کیا اور اس خوبی سے کہ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ رانچی کی شور و سنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادوئے بیان سے پانی ہوگئی، خوشی کی بات ہے کہ رانچی کے اہل علم ونظر نے مولانا کی یاد میں مولانا آزاد اسٹڈی سرکل قائم کیا اور اب اسی کی جانب سے زیر نظر کتاب شایع ہوئی، اس میں لائق مولف نے مولانا آزاد اور رانچی کے تعلق سے تمام تحریروں کو بڑے سلیقہ سے یکجا کردیا ہے، 'احوال' کے زیر عنوان مولانا کے بعض معاصرین کی تحریریں ایک حصہ میں ہیں اور 'آثار' کے تحت مولانا کے مکاتیب اور انکی نمایندہ تحریروں کا انتخاب ہے، کتاب کا ایک اہم حصہ نوادر کا ہے۔ جس میں لائق مولف نے مولانا کے ان مراسلات کو پیش کیا ہے جو انہوں نے حکومت بہار واڈیسہ کے چیف سکریٹری اور رانچی کے ایس۔ پی کو اردو میں لکھے تھے، ان خطوط کے عکس بھی دیئے گئے ہیں، مولانا آزاد کے عقیدتمندوں اور قدردانوں کے لیے یہ کتاب مطالعہ واستفادہ کے لائق ہے۔

ع۔ ص۔